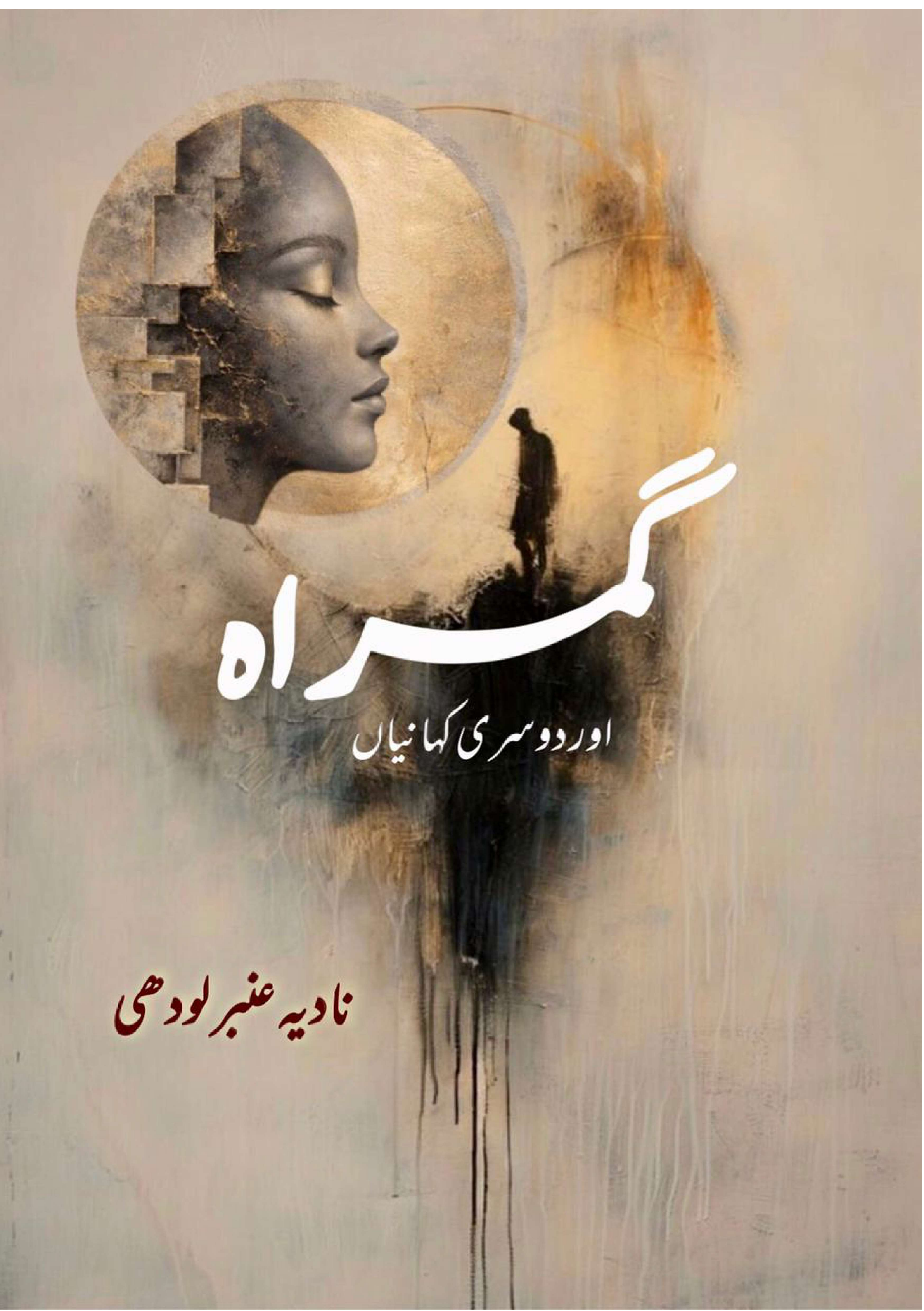


گمراہ

اور دوسری کہانیاں

نادیہ عنبر لودھی

گمراہ

اور دوسری کہانیاں

مصنفہ

نادیہ عنبر لودھی

قلم کتاب ای پبلشرز

واٹس ایپ نمبر 03010487501

نام کتاب: گمراہ اور دوسری کہانیاں

مصنف: نادیہ عنبر لودھی

موضوع: کہانیاں

تزئین و آرائش: محمد عثمان ذوالفقار

کتابت: ابنِ قلم

برقی اشاعت: اپریل 2026ء

سوشل میڈیا انچارج: ماہ رخ شہریار

ناشر: قلم کتاب ای پبلشرز

قلم کتاب ای پبلشرز

واٹس ایپ نمبر 03010487501

انتساب

والد فاروق خان لودھی اور والدہ شمیم لودھی

کے نام

فہرست

کہانی کار سے مکالمہ

نادیہ عنبر لودھی نے شاعرہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ۔ساتھ ساتھ کالم نگار اور مصنفہ کے طور پر بھی اپنی پہچان بنائی۔ادب کے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی اور نام پیدا کیا۔شاعری کے میدان میں جذبات کی فراوانی ،سماج کی ناہمواری ،عشق مجازی اور عشق مجازی سے بالاتر عشق حقیقی کو اشعار کے اسلوب میں برتا۔ان کے کال ممعاشرے کی بہتری کے لیے ہوتے ہیں۔نادیہ عنبر لودھی صاحبہ تقریبا دس سال سے ہمارے ادارے سے منسلک ہیں۔اور گاہے بگاہے ان کی شاعری وتحریر ہمارے اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ہمارے قارئین ان کے کلام اور تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔انکے مضامین میں اصلاحی ،ادبی اور اثباتی رنگ پایا جاتا ہے۔ان کا ادبی سفر محنت ،ہمت اور لگن سے جاری وساری ہے۔ہمارے اخبار کی طرف سے انہیں دس سال قبل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

نادیہ نے نثر وشاعری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔مسلسل محنت کے ساتھ کم وقت میں اپنا نام بنایا ہے۔حال ہی میں ان کے کالموں کا مجموعہ شبِ غم کا جوش اور شاعری کا مجموعہ تعاقب میں خواب منظر عام پر آئے ہیں۔" گمراہ" نامی کہانیوں کی اس کتاب میں شامل کہانیاں مختلف افکار،مختلف سماجی رتبوں اور مختلف نظریات کے حامل کرداروں کی ہیں۔جو اپنے سفید

اور سیاہ دائروں سے مثبت اور منفی راستے اختیار کرتے ہیں۔ یہ کردار کہیں ماحول سے جڑے ہیں اور کہیں خود سے کٹے ہوئے ہیں۔

انکی نفسیاتی گرہیں محترمہ نے عمدگی سے کھولی ہیں ۔مجلس ادارت نادیہ عنبر لودھی ریذیڈنٹ ایڈیٹر خبریں مانچسٹر یو کے کو انکی کاوشوں پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور انکے زورِ قلم کے لیے دعا گو ہے۔

محمد جاوید خان

بانی و چیف ایڈیٹر

خبریں مانچسٹر یوکے

+447775767018

پیش لفظ

کہانی صدیوں سے چل رہی ہے۔ بدل رہی ہے۔انسانوں کو جوڑ رہی ہے۔

کہانیوں کی کتاب گمراہ آپ کے سامنے ہے۔اس سے پہلے میری تین کتابیں "شب غم کا جوش "،"تعاقب میں خواب"اور"خاکدان"منظر عام پر آ چکی ہیں۔

اس کتاب " گمراہ میں ٹوٹل 23 کہانیاں شامل ہیں ۔ جو میں نے گزشتہ چھ ماہ کے عرصے میں لکھی۔ یہ کہانیاں پاپولر فکشن کی مد میں لکھی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں متنوع موضوعات پر ہیں۔ یہ کہانیاں اگر آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیں تو اسے میں اپنی کامیابی سمجھوں گی۔

سوشل میڈیا کی یلغار نے کتاب کو کہیں پیچھے دھکیل دیا ہے۔زندگی کسی فرد کے لیے بھی آسان نہیں ہوتی۔لکھاری کی قسمت میں دہری مشقت ہوتی ہے۔سب ذمہ داریوں پوری کر کے ایک لکھاری عورت کو لکھنے کا وقت ملتا ہے۔

کوئی ہم سے یہ نہیں کہتا کہ آپ رائیٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر لکھتی رہیے۔ہمیں دینی اور دنیاوی فرائض ادا کرنے کے بعد لکھنے کا وقت ملتا ہے۔ پدرسری معاشرے میں ایک عورت سے قربانی کے سوا اور کوئی امید نہیں رکھی جاتی ہے۔ یہ ہی ہمارے سماج کا المیہ ہے۔اس وقت

نئی نسل کو ادب اور کتاب سے جوڑنے کی شدید ضرورت ہے۔

آپ کی آرا کی منتظر

نادیہ عنبر لودھی

ریذیڈنٹ ایڈیٹر۔ خبریں مانچسٹر یو کے

اسلام آباد۔ پاکستان

nadiaumberkhanlodhi@gmail.com

روشن چراغ

اس نے تل ابیب "بن گوریون" ائیر پورٹ سے باہر قدم رکھا تو بونداباندی ہو رہی تھی۔ بارش نے موسم خوشگوار کر دیا تھا۔

اسنے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکی۔ ڈرائیور کو اپنے فون پر لوکیشن پن دکھائی اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ گئی تھی۔

یہ کثیر منزلہ عمارت تھی اس کا مطلوبہ اپارٹمنٹ گراونڈ فلور پر تھا۔ اسے نمبر زبانی یاد تھا۔ چابی اس کے پاس تھی اس نے چابی لاک میں گھمائی اور اندر داخل ہوگئی۔ فرنشڈ اپارٹمنٹ صاف ستھرا تھا اس نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر اشیائے خورد نوش کی خریداری کے لیے قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ مقامی کرنسی اس کے پاس تھی۔ وہ مانچسٹر کے پوش ایریا "ریڈیش" میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی اس کے والدین کٹر یہودی تھے۔ انکا خاندان دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں سیٹل ہوا تھا۔

اس نے جرنلزم میں ڈگری لی تھی۔ وہ غزہ کی موجودہ صورت حال پر رپورٹنگ سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے اسرائیل کا رخ کیا تھا وہ اس وقت "جوڈیا سماریا" نامی شہر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ صبح اس کا ارادہ غزہ کے شہر دیر البلح جانے کا تھا۔ اپارٹمنٹ کی بکنگ اس نے ٹریول ایجنٹ کے ذریعے کروائی تھی ائیر پورٹ پر اسے چابی دی گئی تھی۔

اس کے والدین نے بچپن سے اس کے دماغ میں مسلمانوں سے نفرت بھری تھی۔ وہ یہودیوں کی

مقدس زمین کی محبت میں غزہ آئی تھی۔

اس نے خریداری کر کے آرام کیا اور اپنے لیے کھانا بنایا اسی دوران اس کی والدہ کا فون آ گیا۔
اس کی والدہ نے اس کا حال چال پوچھا اور اسے دیوارِ گریہ پر حاضری کی یاد دہانی کروائی۔ اس نے کھانا کھایا اور سوگئی۔ صبح بیداری کے بعد اس نے ناشتہ کیا ایک سینڈوچ بنا کر ٹوٹ بیگ میں رکھا ضروری سامان ساتھ رکھا اور غزہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔
سڑک سے اس نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو دیرالبح چلنے کا کہا۔ ایک گھنٹے بعد وہ منزل پر پہنچ گئے۔ چیک پوسٹ پر اس کے کاغذات ویزے اور پاسپورٹ کی چیکنگ ہوئی اور اس کا کیمرہ اور سیل فون یہ کہہ کر رکھ لیا گیا کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔
اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور آگے بڑھ گئی۔ سڑک کے اردگرد موجود عمارتیں جلی ہوئی تھی۔ کچھ ملبے کا ڈھیر تھی۔ سامان بکھرا پڑا تھا سڑک کے کنارے اسے دو کمزور سے بچے نظر آئے۔ اس نے بچوں سے انگریزی میں بات کی۔ وہ انگریزی سے نابلد تھے۔ اس نے ان سے عبرانی میں بات کی وہ عبرانی جانتے تھے۔ اس نے ان سے پوچھا" سکول جاتے ہو"

" نہیں سکول بمباری سے تباہ ہوگیا"۔

کھانا کھایا ہے؟

" نہیں ہماری امی مرگئی ہے ہمیں کون کھانا دے گا" بچے نے جواب دیا۔

اس نے بیگ سے سینڈوچ نکالا اور دونوں بچوں کو آدھا آدھا کر کے دے دیا۔

وہ سینڈوچ پر ٹوٹ پڑے۔

پتا نہیں کب سے بھوکے ہیں سلویا نے سوچا.

وہ بچوں کو چھوڑ کے آگے بڑھی اور سڑک پر چلنے لگی ہر طرف تباہی کے مناظر تھے۔ دور تک کوئی ذی

روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور تباہی تھی۔

اسے عجیب سے احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔

چلتے چلتے اسے ایک خالی میدان دکھائی دیا بچوں کے کھیلنے کا گراونڈ ہے شاید وہ سڑک سے اتر کے گراونڈ میں چلی گئی اور ایک بنچ پر بیٹھ گئی اس نے سر گھما کر اِدھر ادھر کا جائزہ لیا تو اس کی نظر ایک بوڑھے آدمی پر پڑی۔

یہ کون ہے؟ اس نے سوچا۔

وہ اٹھ کر بوڑھے کی سمت بڑھی۔

اس نے اس کو ہائے کہا۔

جواب میں بزرگ آدمی نے بھی ہائے کہا۔

وہ آدمی انگریزی جانتا تھا سلویا اس سے سوالات کرنے لگی۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟۔

"اس مکان کے تہہ خانے میں"۔

بزرگ آدمی نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب غیر آباد کیوں ہے"؟

"غیر آباد نہیں ہے تباہ شدہ ہے" آدمی بولا۔

آپ کیا کھاتے ہیں یہاں تو کچھ نہیں ہے؟۔

"اللہ مالک ہے۔ میرا رب بندوبست کر دیتا ہے۔ گزارہ ہو جاتا ہے"۔

"اور آپ کا خاندان"؟ سلویا نے پوچھا۔

"سب جنت میں چلے گئے وہاں وہ سب میرے منتظر ہیں"۔

آپ کی مسلمان ممالک مدد کیوں نہیں کرتے؟ سلویا نے سوال کیا۔

"ان کو تعیّشات پسند ہیں انہوں نے جنت کے بدلے یہ دنیا خرید لی ہے۔"

"اور آپ نے؟"۔

"ہم نے دنیا دے کے جنت لے لی ہے"۔

بزرگ نے کہا۔

"تو آپ کا خدا آپ کی مدد کیوں نہیں کرتا آپ کی فریاد کیوں نہیں سنتا؟۔

ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ آزمائش دے کر شہادت کی موت عطا کر کے ہمارے درجات بلند کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ خیر اور شر کی جنگ میں کون کس کے ساتھ ہے"۔

"میں نے سنا ہے مسلمان بہت برے لوگ ہوتے ہیں آپ تو اتنے برے نہیں ہیں"۔

سلویا کی بات سن کر بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"اللہ حافظ بیٹی"۔

یہ کہہ کر وہ اپنے تباہ شدہ مکان کی سمت چلا گیا۔

سلویا نے واپسی کا ارادہ کیا۔ راستے پر بچے اب نہیں تھے ان کی جگہ خالی تھی۔

سلویا نے چیک پوسٹ سے کیمرہ اور موبائل لیا اور کرائے کے اپارٹمنٹ میں واپس آ گئی یہاں آ کر اس کی عجیب سی کیفیت ہوگئی وہ صوفے پر ڈھے سی گئی اسے بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سینڈوچ بھی بچوں کو دے دیا تھا لیکن بچوں کے مدقوق چہرے آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔

اس کا کھانا کھانے سے جی اچاٹ ہوگیا۔

بزرگ کی باتوں نے بھی کئی سوالات اٹھا دیے تھے۔

مسلم ممالک پاورفل ہیں پھر بھی ان کی مدد نہیں کرتے کیوں؟۔

ماما ٹھیک کہتی ہیں یہ مسلمان عجیب ہی ہوتے ہیں اس نے سوچا۔

وہ سوچتے سوچتے وہیں سوگئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ کچن میں گئی۔ ناشتہ بنایا اور کھایا اور پھر سینڈوچ بنانے لگی اس کے بیگ میں جتنی جگہ تھی اس نے اتنا کھانا بھر لیا۔ سینڈوچ بسکٹ، دودھ کے پیکٹ۔

وہ اپارٹمنٹ سے نکلی۔ ٹیکسی لی اور غزہ جا پہنچی۔

اسے آج راستے میں کوئی انسان نہیں ملا۔ اس نے سوچا بزرگ کو یہ کھانا دے دوں۔ وہ اس کے گھر کی سمت گئی اس نے بیل بجائی۔ گیٹ بجایا کوئی باہر نہیں آیا۔ اس نے سوچا تہہ خانے کا راستہ ڈھونڈتی ہوں۔ گھر کی باونڈری کے اندر گھومتے پھرتے اسے پچھلے صحن میں ایک جگہ مرغیوں کا ڈربہ نظر آیا۔ کچھ سبزیاں بھی زمین میں اگی ہوئی تھی۔ اسے بیسمنٹ کی سیڑھیاں نظر آئی وہ نیچے اتر گئی۔ ایک کشادہ کمرہ تھا ۔جس میں فرش پر بستر بچھا ہوا تھا ایک میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا تھا۔ قرآن پاک اور تسبیح بھی وہی موجود تھی۔ اس نے قرآن اٹھایا اور کھول کر پڑھنے کی کوشش کی۔، جو الفاظ اسے سمجھ آئے ان کا مطلب تو بہت اچھا تھا پھر؟

وہ الجھ کر رہ گئی۔ اس نے اسی میز پر کھانا رکھا اور وہاں سے نکل آئی۔

چند مکان آگے جا کر اس نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے ایک عورت کی جھلک دیکھی اس کی جونہی نظر پڑی وہ عورت چھپ گئی۔ اس عورت سے ملنے وہ اندر کمرے کی طرف بڑھی۔

جونہی عورت نے اسے دیکھا فوراً بازو پیچھے کر لیا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو عورت کا بازو کہنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا زخم علاج نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا اس میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ وہ شدید تکلیف میں تھی۔ گینگرین تیزی سے پھیل رہا تھا۔

"میرے ساتھ ہسپتال چلو" اس نے عبرانی میں کہا۔

"نہیں یہاں کوئی ہسپتال نہیں ہے۔تم جا۔میں ٹھیک ہوں"۔

"نہیں میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاونگی تم مر جا گی"۔

سلویا اسے کھینچ کر باہر لے آئی اور اسے سمجھاتی ہوئی چیک پوسٹ تک لے آئی۔

"اس کا زخم خراب ہو گیا ہے اسے میرے ساتھ ہسپتال جانے دو" سلویا نے ڈیوٹی پر تعینات اہلکار سے کہا

"اس کی اجازت نہیں ہے یہ نہیں جا سکتی"۔

اس نے جواب دیا جب کہ دوسرے اہلکار نے اجازت دے دی۔

"اسے لے جا" وہ سلویا سے مخاطب ہوا۔

سلویا اسے لے کر ٹیکسی میں بیٹھی اور ٹیکسی کو ہسپتال چلنے کا کہا۔

اسپتال میں جا کر اس نے علاج کے لیے اسٹاف سے رابطہ کیا۔

"ہم اس کا علاج نہیں کر سکتے یہ یہودی شہری نہیں ہے یہ اسپتال صرف اسرائیلیوں کے لیے ہے" کورا جواب سن کر سلویا حیران رہ گئی۔

"یہ مر جائے گی" سلویا نے کہا مگر اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔

"سوری"

"آپ جا سکتی ہیں ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے"۔

"میں نے کہا تھا مجھے مت لے جا تم نہیں مانی"۔زخمی عورت بڑبڑائی۔

"تو اپنے خدا کو پکار و تمہاری مدد کرے۔" سلویا نے غصے سے کہا۔

عورت بچاری بس ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔منہ سے کچھ نہیں بولی۔

سلویا باہر نکلی اور سوچنے لگی کیا کروں اس کا۔اپارٹمنٹ میں لے جاں تو علاج کیسے کروں؟

برطانیہ یہ جا نہیں سکتی اس کے پاس ویزہ اور پاسپورٹ نہیں ہے۔

اتنے میں ایک ٹیکسی انکے قریب آ کر رکی۔ڈرائیور نے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اس کا علاج ایک اسپتال میں ہوسکتا ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"ہمیں لے چلو"

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی ایک عمارت کے سامنے رکی ۔اس عمارت کے باہر اولڈ ہاس کا بورڈ لگا ہوا تھا ۔وہ دونوں نیچے اتریں۔اندر داخل ہوگئی ۔ریسپشن پر کھڑی نرس نے زخمی عورت کو اپنے ساتھ ایک کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور اس سے کہا

"بس آپ کا کام ختم آپ جائیں"

وہ باہر نکلی ٹیکسی والا جا چکا تھا۔

اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اپارٹمنٹ چلی آئی۔

سوچوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔

اسے اپنی والدہ کی باتیں یاد آنے لگی۔

ہم یہودی اس دنیا کی سب سے برتر قوم ہیں ۔سب انسان ہم سے کمتر ہیں ۔ہماری سب سے اعلی نسل ہے۔ہم خدا کے خاص ہیں۔دنیا کی حکومت پر ہمارا حق ہے۔ہم جیسا کوئی نہیں ہے۔

کیا اعلی لوگ ایسے ہوتے ہیں اس نے سوچا۔

تین چار دن وہ کسلمندی سے پڑی رہی اس نے واپسی کا ارادہ کرلیا جب کیمرہ اور فون لے جانے کی اجازت نہیں ہے تو رپورٹنگ کیا خاک ہوگی۔

اس نے اپنی والدہ کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔

اس کی والدہ نے اسے دیوار گریہ پر جانے کو کہا جو دعائیں اس کی والدہ نے اسے دی تھیں وہ دعائیں بھی وہاں رکھنے کو کہا۔اگلے دن اس نے ناشتہ کر کے حارالنصاری کے لیے ٹیکسی لی جہاں دیوار گریہ موجود ہے۔وہ عورتوں کے مخصوص حصے میں پہنچی۔کوتل دیوار گریہ کا یہودی نام سا س کے سامنے تھی
۔

کوتل کے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان فاصلہ ہے جس کی وجہ سے درزیں سی بن گئی ہیں ۔انہی درزوں میں سے ایک میں سلویا نے والدہ کی دعاوں کی عرضی رکھ دی۔عورتیں رو رہی تھی وہ خالی ذہن کھڑی تھی اس کا دماغ ماف ہو چکا تھا۔

اس نے خود کو گھسیٹا اور حارالنصاری کی پر پیچ گلیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ بازار تک جا پہنچی یہاں سے اسے ٹیکسی مل گئی اور وہ اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔

اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ ایلس ہے جو ونڈر لینڈ میں گم ہوگئی ہے لیکن اس کے سامنے جو ونڈر لینڈ تھا اسکا نظارہ مایوس کن تھا۔

کیونکہ وہ افسردہ تھی۔اس نے مصمم ارادہ کیا کہ دوبارہ کبھی یروشلم نہیں آئے گی۔

اس نے صبح اپنی ٹکٹ کروانے کے لیے فون کیا تو علم ہوا کہ یمنی فوج کے میزائل حملے کے بعد تل ابیب کا بن گوریان ائیر پورٹ بند کیا جا چکا ہے۔

اسے اب ائیر پورٹ کے کھلنے کا انتظار کرنا تھا۔وہ دو ہفتے کے لیے آئی تھی اس کی ریٹرن ٹکٹ ایک ہفتے بعد کی تھی۔اسنے والدہ کو کوتل جانے کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

تین چار دن اپارٹمنٹ میں گزار کے وہ بور ہو چکی تھیاس نے سوچا آخری دفعہ غزہ کا چکر لگا لوں ۔اس کی فلائٹ میں تین دن باقی تھے۔کل جاونگی۔

صبح اٹھ کر اس نے جتنا کھانے کا سامان تھا۔بیگ میں بھرا۔اور غزہ کی طرف چل پڑی۔چیک

پوسٹ پر اپنی شناخت کروا کر وہ اندر داخل ہوگئی۔آج اسے میدان میں چند بچے نظر آئے اس نے کھانے کی اشیا ان میں بانٹ دیں اور بنچ پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔

"میں تمہارا ہی منتظر تھا آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اٹھ کر بزرگ کے پیچھے چل دی۔

تہہ خانے میں پہنچ کر بزرگ نے اس سے کہا۔

میں نے غزہ پر یہودیوں کے حملے اور مظالم سے متعلق معلومات اور تصاویر اس "یو۔ایس۔بی میں محفوظ کی ہیں۔تم دنیا تک یہ پہنچا سکتی ہو لیکن بہت ہوشیاری سے۔اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو تم جان سے جاؤ گی۔اور یہ تحفہ تمہارے لیے ہے۔خاص۔اسے چھپ کر پڑھنا اور چھپا کر رکھنا۔

اس نے دونوں چیزیں لے لی۔

"اس اعتبار کی وجہ جان سکتی ہوں"۔

"اس کی وجہ تمہارے اندر موجود انسانیت ہے"۔

"میں بھی تو یہودی ہوں"۔سلویا نے کہا

"ہمیشہ شر سے خیر نکلتی ہے۔تمہارے پیشانی پر جو نور روشن ہے ایک دن تمہارے دل میں اتر جائے گا"۔

سلویا کو بزرگ کی بات سمجھ نہیں آئی بس اتنا بولی

"میں دوبارہ یہاں نہیں آؤنگی"۔

"یہاں بہت مایوسی ہے"۔بزرگ نے جواباً کہا۔

"اللہ کے بندے اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔یہ کام بہت احتیاط سے کرنا۔بہت احتیاط

سے۔اب جا اللہ تمہارا نگہبان ہو"۔

سلویا اٹھی اور باہر نکل آئی۔

اپارٹمنٹ واپس پہنچ کر اس نے یو۔ایس۔بی لیپ ٹاپ میں لگا کر دیکھنے کا سوچا پھر اسے بزرگ کی بات یاد آئی اور وہ رک گئی۔

اس نے بہت احتیاط سیو۔ایس۔بی سنبھال لی۔

دوسرا تحفہ قرآن پاک تھا عبرانی ترجمہ کے ساتھ۔اس نے قرآن کھولا پڑھا تو اسے ناقابل بیان سکون ملا۔

ائیر پورٹ کھل گیا اور وہ مانچسٹر واپس پہنچ گئی۔

اس نے بہت غور وفکر کے بعد ایک نیا لیپ ٹاپ خریدا۔

شہر کے دور افتادہ علاقے میں آ کر اس نے یو۔ایس۔بی لیپ ٹاپ میں لگائی لوکیشن کی وجہ سے اسکا آئی پی ایڈریس بدل چکا تھا۔

بزرگ کی دی ہوئی معلومات اور تصاویر دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔اس کی روح کانپ گئی۔اتنا ظلم ایسی بربریت۔

آخر میں اس کے لیے ایک پیغام بھی تھا۔

بزرگ کی ہدایات کے مطابق اس نے سوشل میڈیا اکاؤنٹس بنائے فیس بک،انسٹاگرام،یوٹیوب، ٹوئٹر،ٹک ٹاک پر۔

پھر اس نے تصاویر کی مدد سے ویڈیوز بنا کر اپ لوڈ کی اور مظالم پر مبنی اعداد وشواہد کو ٹیکس کے ذریعے سوشل میڈیا صارفین تک پہنچایا۔

یہ کام اس نے دو دن میں مکمل کیا اس نے بزرگ کا ویڈیو پیغام آڈیو کی شکل میں ریکارڈ کر لیا۔اور

بار بار سنا۔

بزرگ نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی شناخت کبھی کسی پر ظاہر نہ کرے۔

وہ تو میں نے نہیں کی ہے۔فرضی نام سے اکاونٹ بنایا ہے یو۔ایس۔بی ضائع کردی ہے۔لیپ ٹاپ کی میموری ڈیلیٹ کر کے لیپ ٹاپ ضائع کر دیا ہے۔

لیکن پھر انکی اگلی بات کا کیا مطلب ہے۔اس نے سوچا۔

"اعتبار مت کرنا۔راز کسی کے سامنے نہ کھولنا"۔

وہ سوچتی رہی لیکن سمجھ نہ سکی۔

اس کے اپ لوڈ کیے ہوئے مواد کو بہت پذیرائی ملی اس کی آدھی سے زیادہ ویڈیوز وائرل ہوگئی ۔ظالم یہودیوں کا ظلم دنیا کے سامنے آ رہا تھا۔اس کے ٹیکس مواد پر احتجاج اور مظاہروں میں بینرز بنے۔

ایک دن اس کی والدہ کی نظر سے چند وائرل ویڈیوز گزری۔وہ بہت برہم ہوئی۔سلویا بتانے لگی تھی کہ یہ اس نے کیا ہے۔

پھر اسے بزرگ کی بات یاد آ گئی۔

"اعتبار مت کرنا۔راز کسی کے سامنے نہ کھولنا"۔

وہ خاموش ہوگئی۔اس کی والدہ یہودیوں کے گن گانے لگی ۔اور ویڈیو بنانے والے کو صلواتیں سنانے لگی۔

سلویا اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔شکر ہے نہیں بتایا ورنہ آج خیر نہیں تھی۔اس نے دل میں شکر ادا کیا۔

جرنلزم کو اس نے پروفیشن بنانے کا ارادہ ترک کیا اور ایک اسٹور پر ملازمت کر لی۔فارغ وقت میں وہ مطالعہ قرآن کرتی رہی۔اس کے اندر کی دنیا بدلتی گئی اور ایک دن اس نے اسلامک سنٹر میں جا کر

اسلام قبول کرلیا۔ یہ راز اس نے سب سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔اس نے اپنے ظاہری حلیے اور برتا میں کوئی تبدیلی نہیں کی کہ کہیں کسی جو شک نہ ہو جائے۔

کہ ایک دن والدہ اس کے اسٹور آ گئی وہ اندر نماز پڑھ رہی تھی اسے نماز پڑھتا دیکھ کر اس کی والدہ غصے سے پاگل ہوگئی ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے گولی سے اڑا دیں۔جیسے تیسے والدہ گھر پہنچی اس کے والد کو بھی خبر ہوگئی دونوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔

وہ سڑک پر آ گئی۔اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے بزرگ کے الفاظ یاد آئے۔

"ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔وہ آزمائش دے کر شہادت کی موت عطا کر کے ہمارے درجات بلند کرتا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ خیر اور شر کی جنگ میں کون کس کے ساتھ ہے"۔

میرا رب بھی میرے ساتھ ہے اس نے سوچا اور نئی ہمت سے چل پڑی اس راستے پر جو خیر کا راستہ ہے آج اس نے نور ہدایت کو پالیا تھا اور نور اس کے دل میں اتر گیا وہ جلتا ہوا چراغ بن گئی روشن اور پر نور ۔

مقدس سرزمین نے اسے بے حد نوازا تھا۔

شبِ تنہائی میں

زندگی کے سفر میں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ سے عمر بھر کا رشتہ جڑ جاتا ہے۔اس رشتے کو نبھانا پڑتا ہے۔غیروں کو سینے سے لگانا پڑتا ہے۔اپنا بنانا پڑتا ہےلیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے،شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا،اگر ایک بار ہوتا
ترِی نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا،اگر استوار ہوتا

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ بوندا باندی نے جاتی ہوئی سردی کو پھر سے پکار لیا تھا۔فضا یکدم سرد ہوگئی تھی۔گرم بستر سے نکلنے پر اس کے دل آمادہ نہیں تھا۔اس وقت اسے لحاف سب سے بڑی نعمت لگ رہا تھالیکن کام پر جانا تو ضروری تھا۔

"ہائے زندگی کی مجبوریاں" وہ بڑبڑائی۔

اس نے اپنے وجود کو بستر سے کھینچا اور باتھ روم کا رخ کیا۔ وضو کر کے نماز ادا کی پھر وہ بچوں کو جگانے لگی۔اس کے دونوں بیٹے معصوم بیٹے دنیا کی فکروں سے آزاد گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے اس

نے دونوں کو باری باری جگایا۔اور ناشتہ بنانے چل پڑی ۔بچوں کی عمریں بالترتیب چھ سال سے آٹھ سال تک تھیں ۔ پندرہ منٹ میں بچے تیار ہو چکے تھے ۔ بچے یونی فارم پہن کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے ۔ وہ اس دوران میں ناشتہ اور بچوں کا لنچ تیار کر چکی تھی اس نے بچوں کو ناشتہ دیا اور لنچ باکس میں لنچ ڈال کر بچوں کے بیگ میں لنچ باکس رکھ دیے۔

"لنچ پورا کھانا ہے۔سن لیا۔میں دونوں سے کہہ رہی ہوں"۔

"یہ تو ماما آپ روز کہتی ہیں"۔ان میں سے چھوٹا بولا۔

"تو تم کون سا سنتے ہو"اس نے پیار سے کہا۔اتنے میں اسکول وین کا ہارن بجا۔

"ماما اللہ حافظ"بچے ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر بھاگے۔

اس نے گیٹ بند کیا اور دفتر جانے کے لیے تیاری کرنے لگی۔

تیاری کیا تھا سادہ سا سوٹ پہنا۔ بڑی چادر جسم کے گرد لپیٹی۔لوکل بس سے دفتر جا پہنچی۔

دفتر کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی نظر اس آدمی پر پڑی۔اس کا حلق کڑوا ہو گیا اب اس کو برداشت کرنا پڑے گا اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"اس کے کولیگ مرد نے سوال پوچھا۔

اس کا دل چاہا اس آدمی کو کھری کھری سنا دے لیکن مصلحت کے تحت خاموش رہی۔وہ بظاہر ایک ہینڈسم مرد تھا۔دراز قد اور وجیہہ۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا"۔

وہ گویا ہوا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کو وقت نہیں دے سکتی مجھ پر کافی ذمہ داریاں ہیں"۔

اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"بس آپ مجھ سے دوستی کر لیجئے مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے میری بیوی بیمار رہتی ہے"۔مرد بولا

"یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے میرے بچے ہیں۔شوہر کی ذمہ داریاں ہیں۔سسرال ہے۔جاب ہے"۔

اس نے جواباً کہا۔

"بس میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی آپ مجھ سے بات کر لیں میرے ساتھ کچھ وقت گزار لیں۔میں ایک ایسا دوست چاہتا ہوں۔جس کا کبھی ہاتھ پکڑ لیا کبھی سینے سے لگا لیا۔اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

مرد نے جال پھینکا۔عورت کو اس کے شاطرانہ پن پر کراہت سی محسوس ہوئی۔نامحرم مرد اور عورت کی دوستی اور تعلق اس مرد کے نزدیک گناہ نہیں ہے۔عورت نے دل میں سوچا۔

"آپ بہت خوب صورت ہیں۔ایک انجانی سی کشش ہے آپ کے وجود میں۔آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔''اس نے لاشعوری طور پر چادر مزید لپیٹ لی۔

ابنِ آدم نے اپنا آزمودہ نسخہ چلانے کی سعی کی مگر وہ بری طرح سے ناکام ہوا۔

عورت فریب میں نہیں آئی۔

"آپ کے والد تو حافظ قرآن تھے نا"۔

عورت نے اپنی طرف سے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"جی ہاں صرف حافظ نہیں تھے محدث بھی تھے"۔

مرد نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں اپنے اپنے ڈیسک پر چلے گئے۔اور روزمرہ کا دفتری کام کرنے لگے۔

لنچ بریک میں وہ پھر آیا اسے لنچ پر لے جانے کی آفر کی۔

"میں گھر سے کھانا لاتی ہوں باہر کا کھانا نہیں کھاتی آپ کا شکریہ۔"

وہ مایوس لوٹ گیا۔

تین گھنٹے بعد چھٹی کا وقت ہو گیا۔

"اوکے مس صنوبر اللہ حافظ میں گھر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دفتر سے نکل گیا۔

صنوبر دفتر میں ملازمت کرتی تھی اس کی ملازمت کو ابھی ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ دفتر میں مردوں کی ریشہ خطمی کا مقابلہ وہ بہت تحمل سے کرتی تھی۔ یہ ملازمت اس کی ضرورت تھی۔

ارشد نامی یہ شخص کسی نہ کسی بہانے سے اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا اور اسے دوستی کی آفر کرتا رہتا تھا۔ اس کے دھتکارنے کے باوجود وہ باز نہیں آتا تھا۔

دو تین دن کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ میدان میں اتر آیا۔

"آپ مجھے ایک پرمیشن دے دیں پلیز"۔

ارشد نے کہا۔ "میں آفس ٹائم کے بعد آپ سے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔"

سوری" مجھے اس کی اجازت نہیں ہے"۔ صنوبر نے کہا۔

"دیکھیئے اگر آپ اپنے ذاتی نمبر پر رابطہ نہیں کرسکتی تو پھر میں آپ کو سیل فون گفٹ کرونگا جس پر صرف آپ اور میں بات کریں گے رات گئے سمجھ گئی نا آپ"۔ ارشد نے آفر دی۔

"نہیں میں معذرت چاہتی ہوں یہ ممکن نہیں ہے گھر پر سب ہوتے ہیں"۔ اس نے ارشد کو ٹالا۔ دل تو چاہ رہا تھا بے نقط سنا ڈالے۔ لیکن وہ کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی سے فائل پر سر جھکا لیا۔ ارشد بھی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

چند دن گزر گئے اس کی سرد مہری نے ارشد کو بد دل سا کر دیا۔

دفتر کے ایک پرانے ساتھی ریٹائر ہوگئے اور ان کی جگہ ایک نئی خاتون نے چارج سنبھالا ۔ اب ارشد اس نئی کولیگ کے ارد گرد چکر لگانے لگا۔ جلد ہی دونوں کی دوستی ہوگئی ۔صنوبر نے کلمہ شکر ادا کیا۔ کہ اس کی جان چھوٹی۔

صنوبر کے والد کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا والدہ بچاری خود بیٹوں کی محتاج تھی ۔صنوبر ماں کی مجبوریاں سمجھتی تھی۔ وہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے خود ہی ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

دن یونہی گزر رہے تھے خاموش ،اداس اور بے رنگ ۔اپنے دو بچوں کو پالنا اس کی ذمہ داری تھی جسے وہ نبھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی ۔اس کے شوہر کا سال پہلے ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا تب سے وہ تنہا تھی کہ وہ رات آ گئی ۔ایک طوفانی سرد مہر رات جو گھپ اندھیرے اور تیز موسلا دھار بارش لیے اس کے سر پر آسمان گرانے آئی تھی ساون کا موسم تھا۔مون سون ہواں والا طوفان زوروں پر تھا۔ وہ دونوں بچوں کے ساتھ بستر میں دبکی ہوئی تھی موسم برسات نے فضا میں نمی پیدا کر دی تھی ۔ ہر چیز سیلن زدہ لگ رہی تھی۔ بجلی بھی چلی گئی تھی۔ گھپ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔رات کا تیسرا پہر تھا اچانک اس کی آنکھ کھل گ ٔ۔ کمرے میں کوئی تھا۔ٹارچ کی باریک روشنی کی لکیر میں کوئی الماری کے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ ایک سفید پوش بیوہ تھی۔ چند ہزار روپے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا۔اس کے طلائی زیورات دورانِ عدت میں بک گئے تھے ۔وہ دم سادھے پڑی رہی ۔اچانک نقاب پوش نے لائٹ ان کے چہروں پر کی اور جائزہ لینے لگا بچے سو رہے تھے اور وہ سونے کی اداکاری کر رہی تھی ۔نقاب پوش اس کی حسین زلفوں ، دل کش خدوخال اور متناسب سراپے میں گم ہو کے رہ گیا۔اس نے وارفتگی میں اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کا بوسہ لیا تھا کہ اس کی نیت خراب ہوگئی۔شیطان نے اسے بہکا دیا اس نے صنوبر کو بازوں میں بھرا اور اٹھا کے ساتھ والے کمرے میں لے گیا اس نے اسے صوفے پر لٹایا یکدم بجلی آ گئی۔ صنوبر کا بے ترتیب لباس مزید دعوت نظارہ دینے لگا۔نقاب پوش اس پر جھکا اس نے بھر بھری آواز میں

التجا کی کہ اسے چھوڑ دے ۔لیکن وہ نہ مانا اس نے بہت منتیں کیں ہاتھ جوڑے مگر بے سود۔نقاب پوش نے اس کی عصمت تار تار کی ۔عزت لوٹی اور چلتا بنا۔وہ سسکنے لگی ۔تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو بیرونی دروازہ بند کر کے بچوں کے ساتھ آ کر لیٹ گئی ۔

صبح بچوں کو اسکول بھیجنے تک کی اس میں ہمت نہیں تھی ۔وہ بستر میں لیٹی رہی ۔اس میں آج دفتر جانے کی طاقت اس کے بدن میں نہیں تھی ۔زندگی مزید بے رنگ لگنے لگی۔اس کے لیے زندگی کا چہرہ ایسا بدصورت تھا کہ وہ ایک نظر ڈالتی تو دوسری ڈالنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔وہ بھی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں میں دوبارہ مشغول ہوگئی۔

البتہ قسمت جلد ہی اس پر قہقہہ لگانے والی تھی ۔تین چار ماہ کے بعد اس کی طبعیت گری گری رہنے لگی ۔جسے وہ تھکن سمجھ کے نظر انداز کرتی رہی آخر ایک دن وہ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ڈاکٹر نے ٹیسٹ کروائے اور اسے خوش خبری سنادی ۔وہ ماں بننے والی تھی نہ زمین پھٹی نہ آسمان گرا بس اس کے سر پر سارا جہان گر گیا۔وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی پیر من من کے ہو گئے خود کو کھینچ کے گھر تک لائی اور بے حال ہو کے بستر پر گر گئی ایک اذان پھر دوسری پھر تیسری ایک ایک کر کے سب نمازیں قضا ہوتی گئیں ۔اس میں ہمت نہیں تھی ۔ایسے بے دم پڑی تھی جیسے مر گئی ہو۔

وہ بی بی مریم نہیں تھی ایک کمزور، بزدل، گناہ گار، خطا کار عورت تھی۔تعفن زدہ معاشرے کی پروردہ تھی ۔بیوگی کی سفید چادر پر اس نے داغ نہیں لگنے دیا تھا۔اس نے اپنے جذبات مار لیے تھے۔خود میں خود کو دفن کر لیا تھا۔لیکن آج تو چادر سر سے ہی کھینچ لی گئی تھی اور مکمل طور پر کیچڑ سے بھر گئی تھی ۔یہ چادر اب سر پر لینے کے قابل نہیں رہی تھی ۔کون سی بکل میں خود کو چھپائے ۔کہاں جائے ۔کون تھا اس کا یہاں ۔اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔حمل ضائع کروانے کی مدت گزر چکی تھی اسے جلد از جلد کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔بچوں کے سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔کاش جولائی کی وہ برساتی شام اس کی زندگی میں نہ آئی

ہوتی۔کاش!

اس نے بورڈنگ اسکول کا پتا کروایا اور دونوں بیٹے وہاں داخل کروا دیے۔

"تم دونوں اب یہاں رہو گے اور اچھے بچے شکایت کا موقع نہیں دیتے" صنوبر نے بچوں کو سمجھایا

۔

"ماما آپ کب ملنے آئیں گی"۔وہ دونوں ماں سے لپٹے جا رہے تھے۔

"آپ بھی پاپا کی طرح ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟ بڑا بیٹا بولا۔

"نہیں میرے بچے میں آونگی جلد آونگی۔"

وہ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے وہاں سے بورڈنگ کے دفتر آئی۔

اپنی بابت ملک سے باہر جانے کا بتایا اور چھ ماہ تک ملاقات نہ کر سکنے کا بھی بتایا۔

پھر وہ اپنے شہر واپس آئی۔

اس نے گھر کو لاک کیا اور ہمسایوں کو ملک سے باہر جانے کا کہہ کے وہاں سے ایک دور دراز کے شہر میں چلی آئی۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا۔خوبصورت نظارے قدم قدم پر دیدہ ودل اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔

شہر کے مقابلے میں آب وہوا تروتازہ اور فضا خالص تھی۔

یہاں کوئی اس کا واقف نہیں تھا۔جس دفتر میں وہ نوکری کرتی تھی اس کا ایک ذیلی دفتر یہاں تھا ۔اس نے اپنی بیوگی کو دفتر والوں سے چھپایا تھا۔بیوہ عورت مال مفت کی طرح ہوتی ہے یہ ہی سوچ کر اس نے اپنے شوہر سے متعلق حقیقت چھپائی تھی جو آج اس کو فائدہ دے رہی تھی۔گھر ،محلّہ اور مکان بدلنا اس کی مجبوری تھی وہ مکان اس کے شوہر کا تھا اور اہل محلّہ اس کی بیوگی سے واقف تھے۔

نئے شہر میں اس نے ایک کمرہ پے انگ گیسٹ کے طور پر لے لیا۔مالک مکان ضعیف عورت تھی۔

وہ زیادہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی اسے صنوبر کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔صنوبر سر سے پاں تک وہ خود کو عبایا میں ملبوس رکھتی چہرہ بھی مکمل چھپا کے رکھتی ۔بچوں سے اسکا رابطہ۔فون پر رابطہ تھا۔اس نے ایک پرائیوٹ ہسپتال میں نام لکھوالیا۔

اپریل کا مہینہ ختم ہوگیا اس کی ڈلیوری کا وقت آ پہنچا۔وہ تنہا تھی بالکل تنہا۔اس رات زبردستی کا مہمان ساتھ تھا۔بن بلایا مہمان جو لٹیرا بن کر آیا تھا۔

اور آج اس مہمان کی نشانی اس کی کھوکھ میں سانس لے رہی تھی ۔نشانی دینے والا کہیں بے خبر اور پرسکون بیٹھا ہوا تھا اور وہ دردِ زہ سہ رہی تھی ۔

لذت کسی کا مقدر ہے اور درد کسی کا۔قسمت کے اس کھیل میں اوپر والے کی کیا مصلحت تھی وہ نہیں جانتی تھی اس کی ناقص عقل عقل کل کا فہم کیسے حاصل کرسکتی تھی۔

انسان تھی شکوہ زبان پر آجاتا تھا۔

عورت کے لیے فطرت کا قانون کس قدر جابر ہے۔کیا گناہ ہے میرا؟ خود سے سوال کرتے کرتے تھک گئی تھی وہ۔اس نے سوچ لیا تھا بچے پر ایک نظر بھی نہیں ڈالے گی ۔بدنامی کے اس پوٹلی کو خاموشی سے یہیں چھوڑ جائے گی۔

ساری رات تکلیف سہنے اور درد جھیلنے کے بعد اس نے صبح صادق ایک لڑکے کو جنم دیا۔

اسٹاف مبارک دینے آتا اور حیران ہوتا کہ وہ اکیلی ہے۔

ایک خداترس نرس نے اس کی دیکھ بھال کی اور کھانا پہنچادیا۔

دو تین دن بعد ہمت جمع ہوئی تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی ٹیکسی میں بیٹھ کے گھر چلی آئی ۔بچہ ہسپتال کی نرسری میں تھا۔وہیں رہ گیا۔رہ کیا گیا وہ بدنامی کے خوف سے چھوڑ آئی۔

ہسپتال والوں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ہسپتال میں اس نے فرضی پتا اور فون نمبر لکھوایا تھا۔

"بیڈ نمبر چار والی عورت سے شروع سے ہی مشکوک تھی ڈاکٹر صاحبہ۔ایک نرس نے کہا

"جی بالکل وہ بالکل اکیلی تھی" دوسری بولی۔

"جب میں نے بیٹے کی مبارکباد دی تو رونے لگی" تیسری نرس نے لقمہ دیا۔

اب اس بچے کا کیا کریں؟ ڈاکٹر نے مشورہ مانگا۔

" مجھے تو بچاری بہت مجبور لگتی تھی ورنہ کون سی ماں اپنا بچہ چھوڑ کر جاتی ہے اسی خدا ترس نرس نے کہا جس نے صنوبر کے کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔

"ایک ہفتہ انتظار کرو شاید اس کی ماں آ کر اسے لے جائے ورنہ اس بچے کو ایدھی سنٹر بھیج دو" ڈاکٹر نے حتمی فیصلہ سنایا۔

تین چار دن صنوبر نے مزید وہی گزارے۔دفتر سے وہ میٹرنٹی لیو پر تھی۔پھر وہ اپنے شہر واپس چلی آئی۔

بورڈنگ جا کر اپنے بچوں سے ملی۔بچوں کو گلے لگا کر وہ بہت روئی۔

اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی وہ جانتی تھی یا اس کا اللہ۔اس کے دل کا ایک حصہ وہی کہیں پہاڑوں میں رہ گیا تھا۔وہ بچہ اسے خوابوں میں نظر آتا۔اس کی طرف ہمکتا۔لیکن وہ سوائے رونے کے کیا کر سکتی تھی۔

وقت گزرتا گیا بچے پر کیا گزری اس نے پلٹ کے خبر نہ لی۔اس کے دونوں بیٹے پڑھ لکھ کے جوان ہو گئے اور برسر روزگار بھی ہو گئے۔بڑا بیٹا فوج میں چلا گیا وہ اس کے سر پر سہرا سجانے کا خواب دیکھنے لگی۔کبھی کسی طوفانی رات میں اسے وہ واقعہ اور بچہ یاد آتے تو وہ سوچتی کاش وہ بیٹا بھی میرے شوہر کی اولاد

میں سے ہوتا تو آج میرے ساتھ ہوتا۔ وہ اسے کبھی نہیں بھول سکی۔ اسی دوران میں کشمیر سرحد پر ڈیوٹی کرتا ہوا اس کا بڑا بیٹا ڈیوٹی کے دوران شہید ہو گیا۔

وہ بیٹے کی وردی سینے سے لگائے اپنے نصیب پر روتی رہی۔

ابھی اس غم سے دل سنبھلا نہیں تھا کہ دوسرے کو بھی اجل نے آ لیا۔ اسے کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا۔ چھ ماہ علاج معالجہ چلتا رہا۔ لیکن بے سود۔ اسکا دوسرا بیٹا بھی چل بسا۔ وہ تنہا رہ گئی بالکل تنہا۔ تنہائی اسے کاٹنے لگی۔ دن رات اللہ کی عبادت میں گزرنے لگے لیکن اسے کسی صورت قرار نہ آتا تھا۔

تیسرا ناجائز بیٹا بہت یاد آنے لگا تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اس بچے سے ملنے کا سوچا جسے کبھی ہسپتال کے اجنبی پنگھوڑے میں چھوڑ آئی تھی۔

چند ماہ اسی کیفیت میں گزرے۔ پھر بیس سال بعد اس کے قدم اسی راستے پر تھے جس پر کبھی نہ پلٹنے کا پختہ ارادہ کیا تھا۔ زندگی نے اسے کمزور اور بوڑھا کر دیا تھا۔ اور حالات نے اندر سے ختم کر دیا تھا۔

بچے کا پتا پوچھنے اسپتال پہنچی تو ہسپتال سے بچے کے بارے میں پتا چلا کہ اسے ایدھی سنٹر بھیج دیا گیا تھا۔ ایدھی سنٹر گئی تو علم ہوا کہ پانچ سال کی عمر میں اسے ایک بے اولاد جوڑا لے گیا تھا۔ اس نے اس جوڑے کا ایڈریس لیا اور ممکنہ پتے پر جا پہنچی۔

راستہ پھولوں کی خوشبو سے معطر تھا۔ تر و تازہ ہوا اور جھرنے دیکھنے والوں کے لیے ایک دلکش سماں پیش کرتے تھے لیکن اس کا دل تو اجڑا ہوا تھا اسے فضا سے کیا غرض تھی۔ وہ مطلوبہ پتے پر جا پہنچی۔

اس خوبصورت پہاڑی علاقے کا یہ ایک متوسط طبقے کے رہائشی افراد کا گھر تھا۔

دستک کے جواب میں ایک پچاس سالہ شخص نے دروازہ کھولا۔ وہ آدمی اس عورت کو پہلی نظر ہی میں پہچان گیا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی عزت اس نے ایک طوفانی رات میں لوٹی تھی۔ وہ آج بھی ویسی

ہی دل کش تھی۔بس بالوں میں کہیں کہیں سفیدی اتر آئی تھی۔اس دن وہ خود کو روک نہیں پایا تھا وہ چور تھا مگر زانی نہیں تھا یہ اس کا واحد گناہ تھا جس کی اس نے اللہ سے بہت توبہ مانگی تھی۔وہ ضمیر کی خلش کی وجہ سے چوری اور ڈاکے سے بھی تائب ہو گیا تھا۔اس کی ضمیر نے اسے بہت ملامت کی تھی اور اس نے برائی کا راستہ چھوڑ دیا۔اب وہ عزت دار آدمی تھا۔

"جی فرمائیے" آدمی نے کہا۔

" کیا گھر میں کوئی خاتون ہے" وہ بولی وہ آدمی کو نہیں پہچان پائی تھی اس رات وہ آدمی خاموش رہا تھا وہ اس آدمی کی آواز نہیں سن سکی تھی اس آدمی نے چہرہ بھی کپڑے سے چھپا رکھا تھا۔اس کے علاوہ اندھیرا بھی بہت تھا۔

آج آدمی کے چہرے پر سفید داڑھی تھی سر پر نماز والی ٹوپی تھی۔

"جی میری بیوی ہے آپ اندر آ جائیں۔" یہ کہہ کے مرد نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

ایک عورت اندر داخل ہوئی قریبا اس کی ہم عمر۔

"جی بہن کیسے آنا ہوا" عورت نے اس سے پوچھا

صنوبر نے عورت سے کہا کہ وہ اسے ایک کہانی سنانا چاہتی ہے۔آدمی ساتھ والے کمرے کی دیوار سے لگ کر ان دونوں کی گفتگو سننے لگا۔

اس نے اپنی بیوگی ،نوکری ،طوفانی رات سے لے کے بچے کی پیدائش اور پھر دونوں لڑکوں کے انتقال تک کی کہانی سنائی۔عورت کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔دیوار سے لگا مرد بھی آبدیدہ ہو گیا ۔مرد کے گریہ میں اسکے اپنے گناہ کی ندامت کا غم بھی تھا۔گویا عمر میرا بیٹا ہے میرا اپنا خون۔شاید میرے رب کو میری توبہ پسند آ گئی تھی جو اللہ نے میرا بیٹا مجھے لوٹا دیا تھا

میری گود میں پل کر وہ جوان ہوا ہے۔اس آدمی نے نے دل میں سوچا۔

"آپ پہلی خاتون ہیں جس کو میں نے یہ سچائی بتائی ہے اور وہ عورت میں ہی ہوں جس کی یہ کہانی ہے۔ایک لٹی ہوئی عورت۔ایک تہی دست ماں۔آج آپ سے اپنا بیٹا مانگتی ہے۔میرا بیٹا مجھے دے دیں۔ہر طوفانی رات میں میں نے اسے پکارا ہے"۔

صنوبر نے روتے ہوئے عورت سے التجا کی۔

"عمر ہمارا بیٹا نہیں ہے لیکن ہم نے اسے بہت محبت سے پالا ہے۔اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو میں نہیں روکوں گی۔آپنے بہت دکھ اٹھائے ہیں میں آپ کو انکار نہیں کرسکتی"۔

عورت نے اسے حوصلہ دیا۔اتنی دیر میں باہر شور سنائی دیا۔

"امی۔امی"ایک بیس سالہ وجیہہ شوخ شنگ نوجوان مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"آپ یہاں ہیں،میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں"وہ ماں سے لاڈ کرنے لگا۔لڑکے نے بانہیں ماں کے گلے میں حمائل کیں اور ماں کی گال چومنے لگا کہ لڑکے کی نظر اس پہ پڑی"اسلام علیکم آنٹی"لڑکا بولا۔

لفظ آنٹی نے اس کا دل چیر دیا۔آج بیٹے کو پالنے والی جنم دینے والی سے زیادہ معتبر ہے۔ہائے۔میں نے کون سا ماں ہونے کا حق ادا کیا۔اس نے دل میں سوچا۔

لڑکے کی ماں اٹھی اور اس نے سب کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن دیا۔کھانے کے دوران مرد کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر پڑی۔اسے وہ رات یاد آ گئی۔یہ ہی ہاتھ اس عورت نے جوڑے تھے میرے سامنے اور مجھے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔۔پچھتاوے کی ایک لہر نے مرد کے وجود کو غم زدہ کر دیا۔

کھانے کے دوران لڑکا مسلسل چہکتا رہا اور وہ حسرت سے اسے دیکھتی رہی۔

"آپ بہت دور سے سفر کر کے آئی ہیں آج کی رات ہمارے گھر پر گزار لیں"عورت نے اس سے کہا اور وہ مان گئی۔

آدھی رات کو جب سب سو گئے تو وہ کمرے سے نکلی۔ کہ بیٹے کو جی بھر کے دیکھ لوں خدا جانے صبح میرے ساتھ جا سکے یا نہ جا سکے۔لڑکے کے کمرے میں پہنچی اور اسے تکنے لگی۔

تھوڑی دیر گزری۔سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔آدھی رات کو کون رو رہا ہے؟ اسے حیرت ہوئی۔وہ آواز کی سمت بڑھی تو دیکھا کہ گھر کا مالک جائے نماز پر بیٹھا زار وقطار رو رہا تھا۔وہ مسلسل معافی مانگ رہا تھا۔پھر وہ ایک ایک کر کے اپنے سارے گناہ گنوانے لگا۔اپنی چوریاں اپنی غلط کاریاں پھر طوفانی رات میں ایک عورت کا زنا بالجبر۔پھر اپنی توبہ اور اس عورت کے بیٹے کو پالنے پر اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا۔یہ سن کر اس پر تو پہاڑ آ گرا۔تو یہ وہی آدمی ہے۔میری عفت کا لٹیرا، میری روح کا قاتل۔میری اولاد کا غاصب۔اس کے نطفہ حرام کو اپنی کھوکھ میں رکھنا پڑا مجھے۔پھر زمانے کے خوف سے دھتکارنا پڑا۔اس سوچ نے اسے زندہ درگور کر دیا۔

وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی کمرے تک آئی۔ہینڈ بیگ اٹھایا اور گھر سے نکل آئی۔وہ جیسے تیسے گرتی پڑتی بس اسٹینڈ تک پہنچی اور بس کے انتظار میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی۔

"اس آدمی سے بھیک مانگوں۔جس کی بیس سال پہلے میں نے منتیں کی تھیں اور اسے ترس نہیں آیا تھا۔آج اس درندے کے آگے ہاتھ پھیلاؤں"۔

"یہ نہیں ہوگا مجھ سے نہیں نہیں۔'' وہ ہاتھوں میں سر دے کر رونے لگی۔

یہ ممکن نہیں تھا صنوبر کے لیے۔

آنسو اسکے رخساروں پر بہنے لگے۔وہ آج کے واپسی کے سفر میں بھی بیس سال پہلے کی طرح تنہا تھی۔بالکل تنہا۔

غمِ دہر کے فقیر

شہر جوں جوں پھیلتا گیا۔نئی کچی پکی آبادیاں وجود میں آتی گئی۔امیروں کی ہاوسنگ سوسائیٹز، سفید پوش افراد کے لیے سستے رہائشی منصوبے، اینٹوں سے بنی پلستر سے عاری پسماندہ افراد کی رہائشی آبادیاں۔ان کچی آبادیوں میں بغیر منصوبہ بندی کے مکانا تعمیر کیے گئے تھے۔گلیاں کچی تھی۔گٹر ابلتے رہتے تھے۔ننگ دھڑنگ بچے گلی میں اچھلتے کودتے رہتے تھے۔انکی مائیں امیروں کے گھروں میں کام کرتی ہیں۔باپ دہاڑی دار مزدور ہیں۔کچھ دودھ بیچنے والوں نے گھروں میں بھینسیں بھی پال رکھی ہیں۔

اس آبادی میں چار مرلہ پر مشتمل ایک سفیدی چونے سے عاری پرانے، گندے اور بوسیدہ مکان میں خواجہ سراں کا طائفہ اپنے گرو نینا کے ساتھ رہتا ہے۔ٹپکتے ہوئے نلکے، خراب گٹر، سیلن زدہ دیواریں گھر کے نچلے حصے میں جبکہ اوپر والے حصے میں دو کمرے

جدید انداز میں تعمیر کیے گئے تھے۔ہر مورت کو اس کی آمدن کے مطابق کمرہ دیا گیا تھا۔

گرو کی شہرت دور دور تک تھی۔اسے فنکشنز کی کمی نہ تھی۔اسی لیے سڑکوں، چوکوں اور گلی محلوں میں مانگنے کی کبھی نوبت نہ آئی۔گرو نینا جدت کے تقاضوں سے واقف تھا۔اس نے اپنے گروپ کی خوبصورت مورتوں) زنانہ خواجہ سرا(کی سرجریز اور پروسیجرز کروا کے ان کی جلدیں بال اور جسم دیدہ زیب بنا لیے تھے۔اب مینا اور کرشمہ نامی دو خواجہ سرا بڑے بڑے لوگوں کی شادیوں عقیقوں اور فارم ہاوسز پر جاتی اور مال بناتی۔

باقی چار مورتیں جو کہ درمیانی شکل وصورت اور جسامت کی تھی وہ مڈل کلاس کے شوقین افراد کی نجی

محفلیں سجاتی اور مال بناتی۔ دو بڑھی مورتیں گھر کا کام کاج کرتی۔

گرو کو رقص میں مہارت حاصل تھی اس نے اپنی مورتوں کو اس فن میں طاق کر رکھا تھا۔

ان مورتوں کے بدن کے لوچ اور اداؤں پر مرد مر مٹتے ہیں اور نوٹوں کی بارش کر دیتے ہیں۔

گرو کی کمائی تو خوب تھی لیکن وہ اسی گندے علاقے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی کوئی تو مجبوری تھی!

اس نے پیسوں سے پلاٹ وغیرہ خرید رکھے ہیں جن کی کسی کو خبر نہ تھی۔ وہ زبان کا بہت میٹھا ہے۔

مورتیں اس کی بہت عزت کرتی ہیں۔ اور اس کے حکم کی بجا آوری میں ذرا دیر نہیں لگاتی۔

کون سا خواجہ سرا کیسا سے کہاں سے ملا۔ اس تک کیسے پہنچا۔ اس کے والدین اور دیگر معلومات اس کے سینے میں دفن تھی۔ لاکھ پوچھنے پر وہ نہیں بتاتا ہے۔

☆☆☆☆

برقی گھنٹی بجی تو فریحہ جلدی سے بھاگ کر گیٹ کھولنے گئی۔ سامنے شازیہ نامی خواجہ سرا کو دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

خواجہ سرا نے اپنی منہ ہی کھولا تھا کہ فریحہ گیٹ بند کر کے اندر بھاگ آئی۔

" کون تھا بیٹا"۔ خدیجہ بیگم نے پوچھا

"وہی شازیہ کھسرا۔ گرمی میں بھی سکون نہیں ہے۔"

"بری بات بیٹا ایسا نہیں کہتے۔"

خدیجہ بیگم نے کہا۔

"بس آ جاتے ہیں تنگ کرنے"۔

"تو تم کیوں گئی تھی گیٹ پر۔ ضرور تمہارا پارسل آنا ہوگا۔" فریحہ کا بھائی احمد بولا۔

"ہاں تو تم کو کیا ہے"۔۔

اتنے میں دو بار بیل بجی۔فریحہ نے دراز سے پیسے نکالے اور بھاگتی ہوئی گیٹ پر گئی اس نے پارسل لیے اور اندر آ گئی۔

اس کے ہاتھ میں ڈبے دیکھ کر خدیجہ بیگم بولی۔

بیٹا یہ کیا ہے؟۔

"ماما میں نے میک اپ، جیولری، شوز اور ڈیکوریشن پیسز منگوائے ہیں"۔

"وہ جو پہلے ڈھیر لگا ہوا ہے وہ" احمد نے چڑایا۔

"ہاں تو تم کو کیا ہے۔بس جلتے رہو"۔

بیٹی کو کسی اور وقت سمجھاونگی یہ سوچ کر خدیجہ بیگم خاموش ہوگئی۔

فریحہ اپنی چیزیں دیکھ کر خوش ہوتی رہی پھر ولاگ بنا کر اس نے سوشل میڈیا اکاونٹ پر لگا دیا۔

یہ مڈل کلاس افراد پر مشتمل آبادی تھی۔دس مرلہ، بارہ مرلہ اور آٹھ مرلہ کے مکانوں پر پھیلا ہوا یہ علاقہ ملازمت پیشہ اور چھوٹے کاروباری افراد کا مسکن تھا۔خدیجہ بیگم بیس سال پہلے بیاہ کر یہاں آئی تھی وہ نرم دل اور دیندار خاتون ہیں۔مستحقین افراد کی مدد کرتی رہتی ہیں۔شازیہ اور فوزیہ نامی دو خواجہ سرا کئی سالوں سے اس علاقے میں مانگ رہے تھے۔خدیجہ بیگم ان کی مدد کرتی تھی۔

فریحہ لاڈلی بچی تھی۔شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔والدین کی آنکھ کا تارا تھی۔اس سے دو سال چھوٹا احمد دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔

ایک دن جب فریحہ کا موڈ اچھا تھا خدیجہ بیگم نے اسے سمجھانے کی ٹھانی۔

بیٹا اللہ کا کتنا کرم ہے کتنی نعمتیں اس نے دی ہیں۔ہم شمار نہیں کر سکتے اور قیامت کے دن ان سب کا حساب بھی دینا ہوگا۔

ہمارے نبی کی حدیث ہے کہ "میں تمہارے متعلق فقر سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے تمہارے متعلق اس

بات کا اندیشہ ہے کہ دنیا تم پر فراخ کر دی جائے گی جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فراخ کی گئی تھی، پھر تم اس کے متعلق ویسے ہی رغبت رکھو گے جیسے انہوں نے اس کے متعلق رغبت رکھی، اور وہ تمہیں ہلاک کر دے گی جیسے اس نے انہیں ہلاک کر دیا۔" تو بیٹی اس دنیا میں ہم کچھ عرصے کے لیے ہیں۔ہمیں اسراف سے بچنا چاہیے۔ہم سے کمزور افراد ہماری مدد کے منتظر ہوتے ہیں۔ہم اصل میں انکی نہیں اپنی مدد کرتے ہیں جو موت کے بعد ہمارے کام آئے گی

یہ جو خواجہ سرا ہیں جن سے تم نفرت کرتی ہو یہ سماج کے دھتکارے ہوئے افراد ہیں۔ سینے میں دل بھی رکھتے ہیں اور عزت کے مستحق بھی ہیں۔ ہمارا معاشرے ان کو تعلیم اور صحت کی سہولتیں دینے کا روادار نہیں ہے۔جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یہ مانگتے ہیں۔ان سے اچھا سلوک کیا کرو"۔

فریحہ نے ماں کی بات سنی ان سنی کر دی۔

☆☆☆☆☆

ہاؤسنگ سوسائٹی کے بڑے گیٹ کے باہر گارڈ تعینات تھے۔مہنگا پوش علاقہ جس میں رہائش کا سوچنا عام انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔اس گیٹ کے داخلی دروازے سے باہر دو خواجہ سرا فٹ پاتھ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"بڑے امیر رہتے ہیں یہاں۔ بڑے نوٹ ہیں ان کے پاس ایک بولا۔

"ہاں۔ پر ہمیں کیا انہوں نے کون سا ہم کو دینے ہیں ہماری قسمت میں تو دھکے ہیں۔ ہمارا کوئی نہیں ہے۔خدا بھی نہیں"۔

ایسے نہیں کہتے۔اللہ سب کا ہے۔" دوسرا بولا۔

اتنے میں گیٹ سے دیو ہیکل گاڑی نکلی اور زن سے گزر گئی۔

دونوں حسرت بھری نظر سے دیکھتے رہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد کھانے کا وقت ہو گیا دونوں خیراتی دستر خوان کی سمت چل دیے جو قریب ہی ویلفیر والے لگاتے تھے۔

پیٹ کی بھوک مٹا کر وہ دونوں چوک میں کھڑے ہو کر مانگنے لگے۔خواجہ سروں کی زندگی بھی قابل رحم ہے نہ انکا گھر ہوتا ہے نہ در۔

مرد انہیں نازیبا اشارے کرتے ہیں جبکہ عورتیں ان سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔

ان کو انکا اپنا خاندان چھوڑ دیتا ہے۔ان کا حسب نسب مٹا دیا جاتا نہ ان کی شادیاں ہو سکتی تھی نہ انہیں خاندان کا سکھ مل سکتا ہے پھر یہ اپنا درد لے کر کہاں جائیں! قدرت نے انہیں جس آزمائش کے لیے چن رکھا ہے وہ بہت بڑی ہے۔ان کی قسمت میں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔سماج میں مخنث ہونا گالی ہے۔

☆☆☆☆☆

کرشمہ کو گولیاں ماردی گئی۔اسے تشویش ناک حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔

شادی کے فنکشن میں کسی شقی القلب مرد نے کرشمہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

کرشمہ کا لہولہو وجود ایمر جنسی میں اسٹریچر پر تڑپ رہا تھا۔

اسے دیکھ دیکھ کر نینا گرو کی حالت خراب ہو رہی تھی۔آپریشن کی تیاری جاری تھی مگر کرشمہ نے ایمر جنسی میں ہی دم توڑ دیا۔نینا گرو اس کی مورتیں اور دیگر خواجہ سرا ہسپتال میں جمع تھے،ہر ایک جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"ہمیں بنیادی حقوق سے محروم کر کے حشرات کی طرح کونوں کھدروں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ہم ناچ گانا نہ کریں تو کہاں سے کمائیں کھائیں"۔پنکی نے شکوہ کیا۔

"ہمارے گھر والے ہمیں توجہ اہمیت اور پیار سے محروم بچے کی زندگی خیرات میں دیتے

ہیں"۔ڈولی بولی۔

"دنیا ہمیں قبول نہیں کرتی ہے ہمارے اپنے بھیانک خواب سمجھ کر ہمیں بھلا دیتے ہیں۔رانی نے کہا۔

اسی گفتگو کے درمیان کرشمہ کی موت نے سب کو رونے دھونے میں لگا دیا۔ نینا گرو کی کمر ٹوٹ گئی۔کرشمہ سے نینا گرو کو خاص لگا تھا۔کرشمہ سب سے زیادہ کمائی والی مورت تھی۔

اب تدفین کے لیے ایک بے نام نشان دور دراز کے قبرستان کا انتخاب کیا گیا۔کرشمہ کے بوٹوکس، این لارجمنٹ شدہ بدن کو رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ کسی گناہ کی طرح قبر کے حوالے کر دیا گیا۔لاوارث قبر میں پڑا کرشمہ کا وجود دنیا کے غموں سے نجات پا گیا۔

کئی دن سوگ میں گزر گئے آہستہ آہستہ سب دھندے پر لگ گئے

مگر نینا نامی گرو نہ سنبھل سکا۔اس کی طبعیت کچھ دن سے ناساز تھی۔ٹانگ میں مسلسل درد تھا اور سوج بڑھتی جارہی تھی۔

تھک ہار کے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار ہوا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹانگ میں وین کے اندر کلوٹ بن گیا ہے۔دوائیاں دی گئی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

ٹانگ میں خون کی گردش رک گئی تو زہر بننے لگا۔زہر جسم میں پھیلنے سے روکنے کے لیے ڈاکٹرز نے گرو کی ٹانگ کاٹ دی۔

ہوش میں آتے ہی گرو کی چیخیں نکل گئی۔درد، تکلیف اور غم نے گرو کو نڈھال کر دیا۔

درد لا دوا اور عمر بھر کی معذوری سب کے دل بوجھل تھے ایک ہفتے بعد گرو کو ٹھکانے پر واپس لے جایا گیا۔نینا گرو میں تو جینے کی امنگ ہی ختم ہوگئی تھی۔وہیل چیئر اس کا مقدر بن گئی۔

اس نے اپنے چیلوں کی کمائی سے جو پلاٹ خرید رکھے تھے ان میں سے ایک پلاٹ بیچا اور

دوسرے پلاٹ پر کشادہ مکان کی تعمیر کروادی۔ مکان کا نام کرشمہ ہاؤس رکھا گیا۔ اس پسماندہ علاقے سے نکل کر وہ سب نئے گھر میں منتقل ہوگئے۔ صاف ستھری نئی آبادی زندگی کی سہولیات سے آراستہ تھی۔

نینا گرو نے ایک کمرشل پلاٹ پر دکانیں تعمیر کراو کر اپنی مورتوں کے نام کردی۔ جن کے کرائے سے مورتیں ضروریات زندگی پوری کرنے لگی۔ اس نے اپنی مورتوں کو انکی کمائی کا مالک بنادیا۔

اس نے گناہوں اور حرام کمائی سے توبہ کی۔ وہ ایک مدرسے میں دین کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ صبح فجر سے پہلے وہ مدرسے کی راہ لیتا۔ عشاو ہی پڑھ کر کرشمہ کے پاس واپس آتا اور سوجاتا۔

کچھ عرصے بعد اس نے مدرسہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جمعہ کو مدرسہ میں چھٹی ہوتی ہے۔ اس کا چکر کرشمہ کے پاس جمعہ کے دن لگتا۔ وہ چند گھنٹے گزارتا اور واپس چلا جاتا۔

وحشت میں انسان کا سہارا مذہب بنتا ہے۔ نینا گرو بہت سکون میں تھا۔ اللہ کے ذکر نے اسے اطمینان قلبی دیا۔ بس ایک کرشمہ نامی خلش تھی جو دل میں بہت گہری تھی۔

ہائے کرشمہ یہ ایسا غم تھا جو وہ کسی سے نہ کہتا تھا مگر یہ اندر ہی اندر اسے کھاتا رہتا۔

اسے پچیس سال پہلے کا وہ دن یاد آتا جب ٹھٹھرتی شام کو رات کے اندھیرے نے کالی پوشاک پہنا رکھی تھی۔ ایسے میں مغرب کے بعد اس کا دروازہ زور زور سے بجا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو پانچ سالہ خوبصورت بچہ کھڑا پایا۔ بچے کے ساتھ ایک کپڑوں کا تھیلا رکھا تھا۔ اس نے گلی میں یہاں وہاں، ادھر ادھر ہر طرف دیکھا آوازیں دی لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ تھیلا ہاتھ میں پکڑا اور اپنے اڈے کے اندر آ کر دروازہ بند کرلیا۔

بچے کو کرسی پر بٹھا کر اس نے تھیلا کھولا تھیلے میں بچے کے کپڑے جوتے اور ایک رقعہ تھا۔

''نینا گرو اپنا بچہ ترے حوالے کر رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ تو اسے مجھ سے زیادہ چاہے

گی۔اسے رکھتی ہوں تو باقی تین چھوڑنے پڑیں گے اسے چھوڑتی ہوں تو باقی تین زندگیاں سنور جائیں گی۔اسے ترے پاس اللہ کی امان میں چھوڑا۔اس کا نام کرشمہ رکھنا۔پھر ملنے آؤں گی۔''

کرشمہ کی ماں کے آنے کی امید میں نینا گرو نے زندگی کے چوبیس سال اس گندے محلے میں گزارے۔مال و دولت ہونے کے باوجود اس نے کرشمہ کی ماں کے انتظار کی خاطر کرشمہ کی موت تک ٹھکانہ نہ بدلا۔

اس نے کرشمہ کو کبھی اس کی ماں کے بارے میں نہیں بتایا۔وہ کرشمہ کو انتظار کی سولی پر نہیں لٹکانا چاہتا تھا۔

''ہوسکتا ہے مرگئی ہو۔جو واپس نہیں پلٹی۔زندہ بھی ہوئی تو کرشمہ کے لرزہ خیز قتل کی خبر ٹی وی چینل اور سوشل میڈیا پر اس بدنصیب ماں نے سن لی ہوگی۔''اس کا بھی انتظار ختم ہوا اور میرا بھی۔نینا گرو نے خودکلامی کی۔

☆☆☆☆

ٹی وی پر چلنے والی خبر نے کرشمہ کی ماں کو ششدر کر دیا۔اس نے اپنی اولاد کو ایک لمحے میں پہچان لیا وہ خاموشی سے اٹھی اور چھت پر جا کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

''ایک دفعہ جو چھوڑ کر آئی تو پھر سینے سے نہ لگا سکی۔کیسی بدنصیب ماں ہوں میں۔''

وہ خود سے شکوہ کر رہی تھی۔

خواجہ سرا کی ماں ایسی ہی بدقسمت ہوتی ہے بچے کی محرومی اور نامکمل بناوٹ کا ذمہ دار ماں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔بچے کو ذلت کا نشان سمجھ کر مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔گھر والوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر بچہ گھر سے بھاگ کر خواجہ سرا کی ٹولے میں شامل ہو جاتا ہے۔ناچ گانے، بھیک مانگنے اور سیکس ورکر بننے کے علاوہ اس کے پاس کوئی

چارہ نہیں بچتا۔

☆☆☆☆☆

کرشمہ ہاس میں مورتیں بہت خوش تھیں ۔کبھی ناسٹلجیا کا دورہ پڑتا تو اپنے یاد آتے ۔ان کی دھتکار یاد آتی ۔اپنوں کے کترانے نے بچپن سے ہی تنہائی کے خول میں بند کیا تو جنسی درندے نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔تکلیف، ذلت، اذیت، درد خوفناک تجربے کی صورت سہنا پڑا۔معصوم وجود کا روندیجانا سانحے سے بڑا سانحہ ہے۔

انکی باتیں سن کر نینا گرو کو بڑے صحن والا گول محرابوں والا رنگین شیشوں والا حویلی جیسا گھر یاد آنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا ایک جوان عورت اسے پکڑتی ہوئی ۔اس عورت کی ہنسی بہت جاندار تھی ۔کون تھی وہ عورت، مری ماں، میری بہن یا آیا۔

وہ ہنسی میرے بعد زندہ رہی ہوگی یہ خاموشی کی قبر میں دفن ہوگئی ہوگی ؟

وہ حویلی نما گھر کہاں تھا؟

کس محلے کس گلی میں تھا؟

کس شہر کس صوبے میں تھا؟

نینا گرو کو یاد نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا نہ سماج کی سوچ بدلی نہ ان خواجہ سروں کی قسمت۔

نامکمل ادھورے وجود ہوس کے ماروں کا نشانہ بنتے رہے۔جنہیں مرد و زن کی شناخت نہ مل سکی۔ مردانگی کی حسرت میں نسوانیت کی مکمل شکل کی تمنا میں ان کی زندگی گزر گئی۔

چہروں پر سستے میک اپ تھوپ کر نسوانی لباس پہن کر اپنے وجود کی تکمیل کی تلاش میں بھٹکتے رہے۔

☆☆☆☆☆

فریحہ کا رشتہ بہت اچھی جگہ ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مزید خودسر اور ضدی ہو گئی۔ خدیجہ بیگم سمجھاتی رہتی مگر چکنے گھڑے پر اثر نہ ہوتا تھا۔ ریان اس کا منگیتر اس پر جان چھڑکتا تھا۔

اس کا دماغ ساتویں آسمان پر رہنے لگا۔

شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ خدیجہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود اس نے شادی کے کئی فنکشنز رکھے۔

جب خدیجہ بیگم نے سمجھانا چاہا تو فریحہ کے والد بولے۔

"بیگم ایک ہی تو بیٹی ہے ہمارے کوئی بات نہیں ہے اپنے ارمان پورے کر لے"۔

خدیجہ بیگم چپ کر گئی۔

ڈھولکی، مایوں، مہندی شادی، ولیمہ اور پھر دعوتیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔

اس کے بعد فریحہ اور ریان ہنی مون پر ملائشیا چلے گئے۔

واپس آئے تو فریحہ کے چہرے سے نظر ہی نہیں ہٹ رہی تھی۔ خوشی اور خوشحالی نے اسے محسور کن بنا دیا تھا۔

چند ماہ بعد فریحہ امید سے ہو گئی۔ چند ماہ گزر رے۔ لیڈی ڈاکٹر نے الٹرا ساونڈ میں بیٹا بتایا اب تو غرور سے فریحہ کی گردن مزید اکڑ گئی۔ شوہر اور سسرال بھی نخرے اٹھا رہا تھا۔

آخر ڈیلیوری کا دن آن پہنچا۔ زچگی کے بعد جب فریحہ کو ہوش آیا تو کمرے میں اس کی والدہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

ماما ریان کہاں ہے؟

اور بے بی کہاں ہے؟

"بے بی نرسری میں ہے اور ریان گھر گیا ہے" خدیجہ بیگم نے جواب دیا۔

"اور باقی سب" فریحہ نے پوچھا

"وہ نہیں آئے"

"لیکن سب کو بہت انتظار تھا بے بی کا۔" خدیجہ بیگم نظر چرا کر خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد نرس بچہ لے آئی۔

"چلیں فیڈ کا ٹائم ہوگیا ہے۔" نرس نے بچہ فریحہ کو تھمایا۔

فریحہ نے بچے کو فیڈ کروائی۔ خدیجہ بیگم نے بچہ لے لیا اور سلا دیا۔

دو دن بعد وہ گھر آ گئے۔ اس دوران ریان نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ فون بھی نہیں اٹھاتا تھا۔

سارا معاملہ فریحہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ خدیجہ بیگم ہی بچے کو سنبھال رہی تھی۔

دس دن گزر گئے۔ ایک دن بچے نے پاخانہ کیا خدیجہ بیگم نماز پڑھ رہی تھی۔ فریحہ بچے کو چینج کرنے لگی اس نے پیمپر اتارا تو بچے کے نامکمل جنسی اعضا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

وہ زور زور سے رونے لگی اسے ریان کے بدلاؤ کی وجہ سمجھ آ گئی۔ خدیجہ بیگم نے فریحہ کو چپ کروایا اور سمجھایا۔

"بیٹا یہ قسمت کے کھیل ہیں اللہ تعالی اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ بندے کے درجات بلند کرنے کے لیے اس پر آزمائش بھیجتا ہے۔ حوصلے سے کام لو۔"

"اب کیا ہوگا مما ریان اس بچے کو قبول نہیں کر رہا کہیں وہ مجھے چھوڑ تو نہیں دے گا۔"

خدیجہ بیگم کیا کہتی۔ خاموش کھڑی رہی۔

ایک ماہ گزر گیا ریان اپنی والدہ کے ساتھ آیا اور دوٹوک انداز میں بچہ اپنانے سے انکار کر دیا۔

"بچہ خواجہ سرا کو دے دو۔ اگر میرے ساتھ رہنا ہے۔" اس نے فریحہ سے کہا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں۔"

"تو تمہاری میرے دل اور گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔" ریان نے کہا۔

فریحہ نے بچہ دینے سے انکار کر دیا۔اسے طلاق نامہ مل گیا۔

"میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دونگی یہ بھیک نہیں مانگے گا یہ کسی کی ہوس کا نشانہ نہیں بنے گا یہ ناچ گانا نہیں کرے گا۔اس کا کیا قصور ہے جو اسے سزا ملے۔ یہ بھی عام بچوں کی طرح پلے بڑھے گا"۔

فریحہ کا سارا طنطنہ اور تکبر خاک میں مل گیا۔خاموشی سے بچہ پالتی رہتی اور اللہ سے معافی مانگتی رہتی۔اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن خدیجہ بولی۔

"بیٹا خواجہ سراں کی مائیں ان کے لیے چھپ چھپ کر روتی ہیں۔اور وہ بھی ماں ،بہن ، بھائیوں اور اپنوں کے لیے ترستے ہیں۔ان کی جسمانی بناوٹ میں ان کا قصور نہیں ہوتا مگر وہ سزا بھگتتے ہیں۔تمہارا بیٹا تمہیں کتنا پیارا ہے اسکی خاطر تم نے اپنی خوشیوں کی قربانی دی ہے شوہر اور سسرال چھوڑا ہے۔"

فریحہ کا بیٹا عشال تین سال کا ہوا تو اسکول جانے لگا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کی زنانہ خصوصیات نمایاں ہونے لگی اس کی بول چال اور اشاروں کا اسکول کے بچے مذاق اڑانے لگے۔

ایک دن عشال نے گیٹ کھولا تو عشال پر شازیہ خواجہ سرا کی نظر پڑ گئی۔وہ حیرت سے بولی۔

"ارے تو تو ہمارے جیسا ہے۔کاکے"۔

" فکر نہ کر ہمارے پاس آئے گا ایک دن تو۔فوزیہ خواجہ سرا نے کہا۔

" نہیں یہ پڑھے لکھے گا اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا۔"

فریحہ بولی اس نے پیسے ان دونوں کو دے کر گیٹ بند کر دیا۔عشال کو لے کر اندر چلی گئی۔

" کاش ہماری ماں نے بھی جرات سے کام لیا ہوتا تو آج ہم بھی کسی قابل ہوتے"۔

شازیہ نے کہا۔

بے چین جادوگرنیاں

بارش نے جھل تھل کررکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا گلی کوچوں کے گیلے راستوں سے اٹھکیلیاں کررہی تھی۔مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبومعطر احساس بکھیر رہی تھی موسلا دھار بارش کی بوندیں موسم گرما میں فرحت بخش احساس لیے فضا کوخوشگوار بنارہی تھی۔

اس برستی بارش میں وہ چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ پریشانیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔اس زوروں کی بارش میں باہر نکلنے کی کوشش بے کار تھی۔اسے بارش پرغصہ آ رہا تھا۔

"بارش بھی آج ہی ہونی تھی"۔غزالہ بڑبڑائی۔

غزالہ کوروپے کی شدید ضرورت تھی۔گھر میں راشن ختم ہو چکا تھا اس کی کمائی کا واحد ذریعہ اس کا بدن تھا۔اسی کو بیچ کر وہ اپنا اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ پالتی تھی۔اس نے ہوش سنبھالا تو ماں کولوگوں کے گھروں میں کام کے بہانے عصمت فروشی کرتے دیکھا۔ ماں نے جلد ہے اسے اپنی لائن پر لگالیا۔ بڑھاپے اور بیماریوں نے غزالہ کی ماں کے بدن کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔اب وہ ہڈیوں کا پنجر بنی چھلنگا چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔

غزالہ بچپن سے کام چور تھی۔ اس نے لوگوں کے گھروں میں کام کی بجائے سڑک پر گاہک ڈھونڈنے کوترجیح دی۔آج کی بارش نے اس کی روزی پرلات ماردی۔ چاروناچار ماں بیٹی چائے کے ساتھ پاپے کھا کرسوگئی۔

شمسہ ہولے ہولے منیر نیازی کی نظم خلش کے مصرعے گنگنارہی تھی۔

وہ خوبصورت لڑکیاں
دشت وفا کی ہرنیاں
شہر شب مہتاب کی
بے چین جادوگرنیاں
جو بادلوں میں کھو گئیں
نظروں سے اوجھل ہو گئیں
اب سرد کالی رات کو
آنکھوں میں گہرا غم لیے
شکوں کی بہتی نہر میں
گلنار چہرے نم کیے
ہستی کی سرحد سے پرے
خوابوں کی سنگیں اوٹ سے
کہتی ہیں مجھ کو بے وفا
ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے
سکھ کا خزانہ مل گیا

شمسہ تعلیم یافتہ تھی اسے ادب سے دلچسپی تھی ۔ وہ جدید دور کی امراؤ جان تھی ۔
شمسہ اپنے والدین کے وجود سے لاعلم تھی ۔اس نے جب سے آنکھ کھولی اسی کوٹھے پر تھی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ کوٹھا بھی ماڈرن کوٹھی میں تبدیل ہو چکا تھا۔مگر آمدنی اور گناہ کا راستہ وہی پرانا تھا۔
شمسہ کو کبھی کبھی اپنے وجود سے گھن آتی کبھی ۔ اسے خود پر ترس آتا۔کبھی وہ موت کی تمنا کرتی ۔

جب حرام کمائی پر پلا ہوا کوئی عیش پسند بڈھا سیٹھ اسے بک کر لیتا تو اس کی مایوسی ، بے زاری اور تھکان سوا نیزے پر پہنچ جاتی ۔ بدبو دار منہ ، گندے پیلے دانت ، بڑی توند والا جسم ، ہڈیوں سے لٹکا ہوا گوشت ،سفید بال اور ٹھنڈا جثہ ۔ چند ہزار کے عوض یہ سودا شمسہ کے لیے بہت مہنگا تھا۔

مگر وہ مجبور تھی میڈم کے سامنے کسی لڑکی کی نہیں چلتی تھی ۔انکار کا مطلب اذیت ناک سزا کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا ۔میڈم زیبا کے کارندے خونخوار وحشی جانوروں سے زیادہ خوفناک تھے ۔لڑکیوں پر نظر رکھتے اور انہیں سزا بھی ان ہی کے ذریعے دی جاتی تھی ۔

آج کی رات بھی سیٹھ اکبر کے ساتھ اسے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔سیٹھ ہانپنے لگا۔ جب کہ شمسہ نے کوفت سے اپنی بے بسی پر نظر ڈالی ۔ دو آنسو پلکوں سے آزاد ہوئے اور اسکے رخسار پر خاموشی سے بہہ گئے ۔اس نے سگریٹ سلگائی اور لمبے لمبے کش لینے لگی ۔اپنے شکستہ،تشنہ وجود کو سمیٹتے ہوئے وہ کوٹھی (رنڈی کا کوٹھا) پر واپس آ گئی ۔

اس کے ساتھ چار مزید کال گرلز اس کوٹھی پر رہتی تھی ۔ یہ میڈم زیبا نامی خرانٹ عورت کی رنڈیاں (کال گرلز) تھیں ۔

کبھی کبھی شمسہ کو کوئی جوان اور ہینڈسم گاہک لے جاتا۔شمسہ کے لیے جوان کا ساتھ نعمت سے کم نہ ہوتا ۔ وہ بھی انسان تھی ۔ گوشت پوست سے بنی ہوئی ۔فرشتہ تو نہیں تھی ۔اسے بھی جسمانی تسکین کی ضرورت تھی ۔ بدن کی ضرورت بھوک بن کر اسے بھی بے چین کرتی تھی ۔

وہ نا چاہتے ہوئے بھی جذبات کے دہکتے ھوئے تنور کی لو سے مجبور ہو جاتی تھی ۔

وہ ایک ذرہ تھی جو خود سے مہجور تھا۔

آب و رنگ و خط و محراب سے بنا اس کا خوبصورت بدن مردوں کے لیے خاصی کشش رکھتا ہے۔

اس جیسی بے شمار عورتیں سڑک کنارے پر، چوراہوں پر، ہاسٹلوں کے گیٹوں پر۔ ہوٹلوں کی لابیز

میں، پارٹیز کے بیچ میں، میوزک کے شور میں، شراب کے بلوریں جام کی گردش میں، کوٹھوں کی بالکونیوں میں، کام والیوں کی قطاروں میں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے لگی ہوئی تھی۔

"ہمیں کوئی پسند نہیں کرتا فروا" شمسہ نے فروا سے کہا۔

فروا بولی۔"رات گئے گاڑی کے شیشے بجاتے ہاتھ بھی ہم انسانوں کے ہیں جنہیں سماج سیکس ورکر کہتا ہے۔سماج ہم سے نفرت کرتا ہے۔ہماری محرومیاں ہماری مجبوریاں کوئی نہیں سمجھتا شمسہ"۔

"ہمارے پروفیشن میں زیادہ تعداد ان افراد کی ہے جن کو زبردستی اس پروفیشن میں جھونک دیا گیا۔ ہم چاہنے کے باوجود اس دلدل سے نکل نہ سکتے۔" شمسہ بولی۔

کبھی کبھی شمسہ کا واسطہ نفسیاتی، جنسی مریضوں سے پڑ جاتا۔

انسان نما یہ درندے اسے ربر کی گڑیا سمجھ کر توڑ نا مروڑ نا اپنا فرض سمجھتے۔نت نئے تجربات اور سنسنی خیز لمحات کی طلب میں خریدار آتے۔اس کے احتجاج کے نتیجے میں خریدار ہونے کا طعنہ دیتے۔ چند گھنٹوں کے یہ خریدار اس کی روح اور جسم کو کچل کر چل دیتے۔اپنے زخموں کو سیتے سیتے وہ تھک جاتی۔

☆☆☆☆☆

آئمہ نے تیار ہو کر تنقیدی نظروں سے اپنے سراپے کو جانچا۔ٹرائی پوڈ پر سیٹ کیا ہوا موبائل آن کیا اور ٹک ٹاک بنانے لگی۔لہراتے ہوئے بل کھاتے ہوئے، ادائیں دکھاتے ہوئے اس نے ویڈیو آپ لوڈ کی۔فلٹرز نے آتش حسن کو دو آتشہ کر دیا۔ہوشربا اداؤں نے منچلوں، ٹھرکی بڈھوں کے دلوں پر چھریاں چلا دی۔

یہ ٹک ٹاک اس کی کمائی کا ذریعہ تھی۔اس سے پہلے اس نے انسٹا اور یوٹیوب پر ویڈیوز اپ لوڈ کی تھی لیکن وہاں اسے کامیابی یعنی گاہک نہ مل سکے۔پھر اس نے فیس بک کا سہارا لیا۔فیس بک پر کنگلے تلنگے عاشقوں کی بھرمار تھی جو بغیر پیسے کے عیاشی کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ٹک ٹاک پر اسے گاہک بھی

ملے۔اپنے ہم خیال دوست بھی۔اس کا دھندا زوروں پر چل رہا تھا۔وہ بہت خوش تھی۔چند دن بعد اس کی سال گرہ تھی جس کا اعلان اس نے آج کی اس ٹک ٹاک ویڈیو میں کیا تھا۔عاشقوں کے میسیجز اور کالز کا جواب دیتے ہوئے وہ بہت پرجوش تھی۔اپنے خیالوں میں تحائف اور دعوتوں کی ایک لسٹ وہ تیار کر رہی تھی۔

لاہور کے مڈل کلاس علاقے میں اس کا سات مرلہ کا مکان تھا۔باپ ملک سے باہر تھا۔جبکہ آئمہ کی ماں کے اپنے دوست تھے۔آئمہ کی ماں آزاد خیال عورت تھی۔اس کا شوہر کئی سال پہلے ملک سے باہر گیا تو آئمہ کی ماں خالدہ بیگم نے اپنی جوانی کو صبر کے بھینٹ چڑھا کر ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔مرد دوست بنا لیے اس کی زندگی رنگین ہوگئی۔شامیں حسین ہوگئی۔آئمہ بھی ماں کے نقش قدم پر چل پڑی۔پیسے کی کمی نہیں تھی۔دونوں کا مقصد عیاشی تھی۔آئمہ کے دوستوں اور عاشقوں نے دھوم دھام سے اس کی سالگرہ منائی۔

جب پارٹی ختم ہوگئی آئمہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تو دوسرے صوبے سے آیا ہوا اس کا ایک سرپھرا عاشق آئمہ کے گھر کے باہر آ پہنچا۔اسے آئمہ نے سالگرہ کی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔فراز نامی عاشق کو تو آئمہ سے پارٹی نہیں کچھ اور درکار تھا۔تحائف لیے وہ آئمہ کے کمرے میں رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا پہنچ گیا۔آئمہ کا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔اس نے آئمہ کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی۔آئمہ کی مزاحمت پر اس نے آئمہ کو گولی ماردی۔پسٹل پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔کسی کو خبر نہ ہوسکی_ مجرم موقع واردات سے خاموشی سے فرار ہوگیا۔چند گھنٹے بعد آئمہ کے گھر والوں کو خبر ہوئی۔آئمہ کی ماں خالدہ بیگم کے تو ہوش اڑ گئے۔اکلوتی اولاد کا قتل اسے زندہ درگور کر گیا۔تھانے میں مقدمہ درج کروایا گیا۔تفتیش شروع ہوگئی۔آئمہ کا والد بھی پاکستان آ گیا۔خاندان کی بہت بدنامی ہوئی۔

☆☆☆☆☆

سرمد دو سال سے بے روزگار تھا۔ جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے وہ تھک گیا تو ایک دوست نے اسے پیسہ کمانے کے لیے سیکس ورکر بننے کا مشورہ دے دیا۔ شکل وصورت سرمد کی اچھی تھی دراز قد اور خوبرو نوجوان تھا۔ چالیس پچاس سال کی خواتین جن کے شوہروں کے پاس بیگمات کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ سرمد کی گاہک بن گئی۔ سرمد کا یہ دھندا چل گیا۔ اسے پیسے بھی ملتے اور کسی بیگم سے تحفہ بھی مل جاتا۔

تنہائی کی ستائی ہوئی یہ بیگمات دولت سے مالا مال تھی۔ بچے ان کے اپنی زندگیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انکے تھکے ہوئے بدن سکون کے لمحات کی تلاش میں تھے۔ انکے شوہر انکو چھوڑ کر کال گرلز کے ساتھ راتیں گزارتے۔ یہ جلتی کلستی رہ جاتی۔ توجہ اور اہمیت سے محروم یہ خواتین سرمد کی رومانوی باتوں اور تعریفوں سے بہت خوش ہوتی۔

☆☆☆☆

شمسہ کی ساتھی لڑکی فروا ایک ندیم نامی نوجوان کی لچھے دار باتوں میں پھنس گئی۔ ندیم کے محبت کے جھانسے میں آ کر وہ ندیم کے ساتھ بھاگ گئی۔ میڈم زیبا نے انسپکٹر کی جیب گرم کی۔ انسپکٹر نے مستعدی کا مظاہرہ کر کے ندیم اور فروا کو پکڑ لیا۔ دونوں کو میڈم زیبا کے کہنے پر حوالات میں ٹارچر کیا گیا۔ جب دونوں کے کس بل نکل گئے تو فروا واپس اڈے پر اور ندیم اپنے باپ کے گھر پہنچ گیا۔

☆☆☆☆

شہر شب ماہ تاب کی یہ بے چین جادوگرنیاں، خوبصورت لڑکیاں دشتِ بے وفا کی ہرنیاں ہیں۔
اپنوں کی نظروں سے اوجھل، سرد کالی راتوں میں نم چہروں کے ساتھ بہتے اشکوں سے تر رخسار لیے یہ اپنے جادو کے طلسم سے اجنبی شوقین مزاج مردوں کو گھائل کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن ان کا جادو انکے اپنے کام نہیں آتا۔

گمراہ

صبح کے تین بجے تھے۔آ فتاب اپنی جلوہ آفرینیوں کے ساتھ طلوع ہونے کی تیاری کررہا تھا۔فضا متبرک تھی ۔پرنور ساعتیں تھیں ۔سحر خیزوں کی پیشانیاں جائے نمازوں پر ٹکی ہوئی تھیں ۔توبہ استغفار لبوں پر جاری تھی ۔رقتِ قلبی سے سحور کا لطف دوبالا ہورہا تھا۔کچھ سلیم القلوب روحانیت طلب مسلمان لطیفہِ قلبی میں مشغول تھے۔بدن ساکت ،زبان خاموش اور دل ذکرِخفی سے دھڑک رہے تھے ۔ہر دھڑکن اپنے رب کے عشق میں عالمِ وجد میں تھی ۔پورا بدن اور دل ایک لے پر لب ڈھبکے ساتھ اللہ اللہ کرر ہے تھے۔

بہت دور بہت اوپر جہاں کائنات کی وسعتیں ختم ہوتی ہیں ۔رب دوِ جہاں اپنے دیوانے اور عاشقوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

مانگنے والوں کی جھولیاں بھر رہی تھی اور سوئے ہوئے بدن غافل تھے۔

کہ سفید رنگ کی روشنی آسمان پر نظر آنے لگی۔صبحِ کاذب پھیلنے لگی اور فجر کی اذان ہوگئی۔فجر جس کی قسم اللہ نے مقدس کتاب میں کھائی ہے اسی نمازِ فجر کو ابتدائی لمحات میں ادا کرنے کی برکت ہی الگ ہے۔

☆☆☆☆

طاغوتی قوتیں بھی میدان میں موجود تھی ۔خیر وشر کی جنگ جوازل سے جاری تھی اس میں ابلیس

کے پیروکار نئے نئے مکھوٹے لگا کر آتے تھے۔انسانیت کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے پاس کئی شعبدے تھے۔

وہ خاموشی سے کھلے آسمان تلے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے۔وہ روشنی کی قوتوں "روح القدس "اور "سپنتا مانیو" کو پکار رہا تھا۔اس آدمی کا نام "سیم ہیاوا تھا۔اس کے بعد سیم ہیاوا آتش کدے کے اندر آیا اور آگ کے سامنے کھڑا ہو کر عبادت کرنے لگا۔

جب کہ ڈی سوزا نامی "مغ "پجاری آتش کدے میں روشن آگ کے سامنے کھڑا پہلے ہی سے عبادت کر رہا تھا۔مذہبی رسومات ادا کر کے وہ "اوستا میں لکھی ہوئی کتاب" دساتیر کا مطالعہ کرنے لگا اور آخر میں اس نے اہورا مزدا سے دعا کی۔

یہ آتش کدہ ایران کے "یزد" شہر میں" فہدان" میں واقع تھا۔

سیم ہیاوا آتش کدے سے نکلا اور اپنے گھر پہنچا۔

اس کے ضعیف والدین اس کے منتظر تھے۔اس کے والدین آزاد خیال ایرانی تھے وہ مغربی لباس زیب تن کرتے تھے اور شراب بھی پیتے تھے۔پرانا پشتینی مکان تھا جس میں وہ رہتے تھے۔سیم کی دو بہنیں لندن میں مقیم تھی۔اور باقی رشتہ دار یہیں فہدان میں رہتے تھے۔اس کے والدین کو اس کے آتش کدے آنے جانے کی خبر نہیں تھی۔

ان کے گھر کا ماحول لبرل تھا وہ رضا شاہ پہلوی کی فکر اور سوچ سے متاثر تھے۔

سیم نے ناشتہ کیا اور اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ ہو گیا۔

اس نے اپنے فیس بک گروپ میں موجود ممبران کو ہائے کہا اور اپنے مذہب کی تعلیمات دینے لگا۔

یہ تعلیمات ان کی مذہبی کتاب سے لی گئی تھی۔اسی کتاب کے اقتباسات وہ فیس بک پر فیس بک پوسٹ کی شکل میں لگاتا تھا۔

شام میں ان کی زوم میٹنگ طے تھی۔ جس میں سیم ان تعلیمات کی تفصیل بیان کرے گا۔

سیم انگریزی زبان میں ماہر تھا۔ اس کے فالورز میں بڑی تعداد مسلمان، ہندو، افریقی اور انگریزوں کی تھی۔ انگریزی زبان میں ہی گفتگو کی جاتی تھی۔

سازشی نظریات خفیہ علامات اور خفیہ تصاویر کی نشانیوں پر پروان چڑھتے ہیں۔ پر اسراریت میں مبتلا کر کے انسانوں کو گمراہ کیا جاتا ہے انسانی دماغ ہمیشہ سے جستجو کا قائل رہا ہے۔" آئی آف پراویڈینس" بھی ایک ایسی ہی تصویری علامت ہے جو دراصل مثلث کے اندر رکھی ہوئی ایک آنکھ کی تصویر ہے۔ گمراہی کے اس دین کی یہ تعلیم انٹرنیٹ کے ذریعے تیزی سے پھیل رہی تھی۔ جن نوجوانوں کو گھر سے دین کی تربیت نہیں ملی تھی وہ اس گمراہ ٹولے کا آسان شکار تھے۔

" آئی آف پراویڈینس" ان کا مخصوص نشان تھا۔

اس گروہ میں شامل افراد کے لیے فرضی ناموں کا استعمال کیا جاتا تھا تاکہ ان کی شناخت خفیہ رہے۔ چار مذاہب عیسائیت، یہودیت، ہندوازم اور آتش پرستی سے تعلیمات لے کر ان لوگوں نے اپنا ایک نیا دین تیار کر لیا تھا اس دین کی تبلیغ تیزی سے جاری تھی۔ وہ اعلی کاہن ملِک صِدق کے دوسرے جنم کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ ان کے مطابق جب ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد ستر ہزار ہو جائے گی تو نیلے رنگ میں عبادت میں مصروف ان کے "میلچزیڈک" (ملک صدق سالم کے بادشاہ) کا ظہور ہو جائے گا۔ ان کا ماننا تھا کہ اس وقت ان کا ملک صدق دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور ان کی دعائیں سن رہا ہے۔

مسلمانوں کو مرتد کرنا اور اس دین میں انہیں شامل کرنا پھر اسی دین کے ذریعے ملِک صِدق کی آمد پر اسکی پیروی کرتے ہوئے دنیا پر قبضہ کرنا۔ یہ تھے ان کے مقاصد جن کے لیے وہ دن رات محنت کر رہے تھے۔ سیم ایک بے روزگار نوجوان تھا۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی سارا دن آوارہ پھرتا رہتا

تھا۔آتش کدے کے مغ (پجاری) نے اس سے دوستی کرلی۔یہ پجاری فہدان میں درپردہ نئے مذہب کا کرتا دھرتا تھا۔اس نے سیم کو بھی اپنے رستے پر لگا لیا۔

☆☆☆☆

موسم ابر آلود تھا۔لندن کی وہ شام دل والوں کے لیے رومانوی تھی۔لیکن غم کے ماروں کے لیے، قسمت سے ہاروں کے لیے اس موسم میں کوئی رنگینی نہیں تھی۔زویا کا رو رو کر برا حال تھا۔اس کی ایک ہفتہ پہلے اپنے شوہر سے علیحدگی ہوئی تھی۔اس کا شوہر لالچی اور مکار آدمی تھا۔اس نے زویا کے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے سے اس کا بینک اکاونٹ خالی کر دیا تھا۔زویا کے والد نے پولیس کو بلا کر اسے گرفتار کروا دیا تھا۔جعلسازی کی وجہ اس کے شوہر قاسم کا ویزہ بھی منسوخ ہو گیا تھا جلد ہی اسے پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جائے گا کیونکہ وہ "سپاوز" ویزے پر پاکستان سے لندن آیا تھا۔ان حالات میں قاسم نے زویا کو طلاق دے دی۔

زویا کی ماں احساس کمتری کا شکار چھوٹے قد کی ایک معمولی شکل وصورت کی عورت تھی۔تعلیم بھی واجبی تھی۔وہ سارا دن گھر کا کام کرتی رہتی،سیل سے سستی چیزیں خرید کے صندوق میں بھرتی رہتی اور واٹ ایپس پر رشتہ داروں سے غیبت کرتی رہتی تھی۔اسے بیٹی سے اس کا غم بانٹنے کی فرصت نہیں تھی یا شاید شعور نہیں تھا۔

اس کے باپ کا گروسری اسٹور تھا۔انہیں لندن میں رہتے پندرہ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔پاکستان میں ان کا آبائی گھر ساہیوال میں تھا۔وہ اکلوتی تھی۔اپنا غم بانٹنے کے لیے اس کے پاس کوئی کندھا نہیں تھا۔پاکستان میں رشتہ داروں کو اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی گئی تھی۔

ان حالات میں زویا فیس بک سکرولنگ کر رہی تھی کہ اس کی نظر سے ایک پوسٹ پر پڑی۔

"وہ آئے گا وہ جو مِلک صِدق سالم کا بادشاہ اور خدا تعالیٰ کا کاہن ہے۔جب ابراہیم نبی

بادشاہوں کو شکست دیکر واپس آرہے تھے تو مِلک صِدق ابراہیم نبی سے ملا اس دن ملک صدق نے ابراہیم نبی کو مبارک باد دی"۔

اس عبارت نے زویا کے ذہن میں کئی سوالات کو جنم دیا اس نے یہ نام پہلی دفعہ سنا تھا۔اس نے فیس بک مسنجر میں جا کر سیم سے سوالات کیے۔

سیم نے اس کے سوالات کے جوابات دیے۔زویا کا ذہن بھٹک گیا۔

پھر سیم روزانہ زویا سے ہیلو ہائے کہنے لگا۔اور اس کا حال چال پوچھنے لگا۔سیم کی اگلی پوسٹ نے زویا کو مزید الجھن کا شکار کر دیا۔

"چنانچہ وہ دوسرے مقام پر بھی کہتا ہے کہ تو ملکِ صِدق کے طور پر ابد تک کاہن ہے۔(عِبرانیوں 6:5)

اور اسے خدا کی طرف سے ملکِ صِدق کے طور کے سردار کاہن کا خِطاب مِلا۔(عِبرانیوں 10)

زویا نے سیم سے اس عبارت کے بارے میں سوالات کیے سیم نے اسے اپنا نمبر دیا اور کال کرنے کا کہا۔

زویا نے اسے کال کی تو سیم نے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں زویا کو پھنسا لیا۔وہ زویا سے ہمدردی کرنے لگا اس کی جھوٹی تعریفیں کرنے لگا۔زویا نے اپنی نجی زندگی کی تفصیلات اسے بتائی تو وہ زویا سے مزید قریب ہو گیا۔انکی روزانہ بات ہونے لگی۔اس نے زویا کی برین واشنگ کر کے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔زویا نے گوشت کھانا چھوڑ دیا۔سبت (یہودیوں کا دن) کے دن وہ کوئی کام نہ کرتی۔وہ لندن میں موجود ہندوؤں کی عبادت گاہ "مندر، یہودیوں کے عبادت گاہ" سینا گاگ، آتش پرستوں کی عبادت گاہ "اگیاری کے چکر لگانے لگی۔جن عمارتوں کے اندر داخلہ منع تھا وہ ان کو باہر سے دیکھتی رہتی۔

وہ سیم کی سکھائی ہوئی رسومات ادا کرنے لگی۔صبح فجر سے پہلے وہ کھلے آسمان تلے کھڑی ہو کر روشنی

کی قوتوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی پھر ایک برتن میں آگ جلاتی اور آتش پرستی کا اہتمام کرتی ۔اس نے اپنے بازوں میں مختلف رنگوں کے بینڈز پہن لیے ۔ایلومیناتی شکلوں والے کارڈ اس نے کمرے میں جگہ جگہ لگا دیے۔

اس کے پاس ایلومیناتی کے دس نشانوں پر مشتمل کرسٹل کے چھوٹے چھوٹے بت تھے ۔ وہ بت ماتھے پر باندھ لیتی اور سیم کی بتائے ہوئے کلمات پڑھتی رہتی ۔ان سب حرکات سے اسے اس کی ضدی طبعیت کی تسکین ہوتی ۔

اس کی سرگرمیوں سے اسکے گھر والے بے خبر تھے یعنی اس کے والدین ۔ایک دن وہ اپنے دورے پر کسی مندر کی خاک چھاننے گئی ہوئی تھی کہ اس کے والد اس کے کمرے میں کسی کام سے گئے وہ کمرے کا حال دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔

جونہی زویا نے گھر میں قدم رکھا باپ کی باز پرس پر زویا پھٹ پڑی ۔اس نے برملا اپنے مرتد ہونے کا اعلان کیا۔" مسلمانوں کا اللہ ! کس اللہ کی بات کرتے ہیں آپ !۔اللہ نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔اس نے ایک دھوکے باز کو میرا شوہر بنایا۔اس نے کبھی میری دعا نہیں سنی۔چھوڑ دیا ہے میں نے آپ کے اللہ کو" زویا چلائی۔

یہ سن کر زویا کا باپ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا پھر اس نے سوچا زویا کو پیار سے سمجھاتا ہوں ۔اس نے زویا کو پکڑ کے صوفے پر بٹھایا اور اسے سمجھانے لگا۔اس نے زویا سے کہا

"اللہ تعالی کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے ۔اس کی مشیت ہم نہیں سمجھ سکتے آزمائش مسلمان کے گناہ جھاڑتی ہے۔اور آخرت میں اس پر صبر کا اجر ملے گا"

"آخرت کس نے دیکھی ہے ۔ مجھے اس زندگی میں سب کچھ چاہیے اپنے خدا سے کہیں مجھے دے"۔

زویا نے بحث کی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔میرا اللہ بہت غفور رحیم ہے۔ابھی بھی وقت ہے تائب ہو جا۔اللہ معاف کر دے گا۔اسے اپنے بندے کا لوٹ کے آنا بہت پسند ہے۔گمراہ جب درست راستے پر لوٹتا ہے تو اللہ اسکے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔" اسکے باپ نے دلیل دی۔

زویا کی ماں بولی

"تو ہماری اکلوتی اولاد ہے زویا۔ہم دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے"۔

"دنیا والوں کو چھوڑو قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے"۔

زویا کا باپ کرب سے بولا۔

وہ زویا کو سمجھاتے رہے دلائل دیتے رہے لیکن زویا نہیں مانی۔آخر اس کے باپ کا صبر جواب دے گیا۔وہ غصے سے بولا۔

"تم بہت پچھتاؤ گی۔اللہ کے عذاب سے ڈرو۔ابھی بھی وقت ہے۔اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔اس کا عذاب بہت شدید ہے یہ نہ ہو وہ تمہیں عبرت کا نشان بنا دے" لیکن زویا پر کچھ اثر نہ ہوا آخر تنگ آ کر زویا کا باپ بولا

"دفع ہو جا میرے گھر سے ایک مرتد کی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے" باپ نے اسے دھکا دے کر گھر سے نکال دیا۔اس کی ماں نے اس کے باپ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔

وہ قونصل خانہ چلی گئی۔قونصل نے اسے رہنے کے لیے جگہ دے دی اور اس کی سوشل سکیورٹی بھی مقرر کر دی جو اسے ہر ماہ ملنے گی۔اس سے وہ اپنا گزارہ کرنے لگی۔

زویا نے سیم سے بات کی اور سارا ماجرا اسے کہہ سنایا۔سیم نے اسے فہدان ایران آنے کا کہا۔

اس کے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔سیم نے اسے پیسے کمانے کا ایک آسان راستہ بتا دیا۔

وہ شام کو تیار ہو کر اسکوائر پر کھڑی ہو جاتی اور پچاس پونڈ پر رات گاہک کے ساتھ گزار لیتی۔

اس کے نئے مذہب میں جسم فروشی، خودکشی، مے نوشی اور جوا جائز تھے۔

اس نے ایک ماہ میں ٹکٹ کے پیسے جمع کر لیے اور وہ فہدان پہنچ گئی۔

لندن میں اس کی سیم سے ویڈیو کال پر کئی دفعہ بات ہوئی تھی۔سیم ایرانی النسل تھا۔اس کی سرخ سفید رنگت تھی۔اس کے مقابلے میں زویا کا رنگ گہرا سانولا تھا نقوش بھی دبے دبے تھے جسمانی طور پر بھی وہ پرکشش نہیں تھی۔ضرورت سے زیادہ دبلا پتلا جسم تھا۔

اسے دیکھ کر سیم کو خاصی مایوسی ہوئی ویڈیو پر تو وہ پھر بھی بہتر دکھائی دیتی تھی۔

خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔

سیم اور زویا کی شادی اسلام کے مطابق ہوگئی۔اس نے کونسل میں نکاح نامہ جمع کروا کر ویزہ کی درخواست دے دی۔دنیا کی نظروں میں وہ اور سیم مسلمان تھے۔وہ سیم کے خاندان کے ساتھ رہنے لگی۔اس کا دل بوجھل سا رہتا تھا۔نئی زندگی کے آغاز کے باوجود بھی کہیں کوئی کمی تھی۔جس کو سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔کبھی کبھی اس کا دل چاہتا بہت روئے چیخے، چلائے۔

دوسری طرف سیم بے روزگار تھا۔وہ خود اپنے والد کا محتاج تھا۔وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترسنے لگی۔زویا اپنے والدین سے مزید نفرت ہونے لگی۔پہلے شادی ایک دھوکے باز سے کر دی پھر گھر سے نکال دیا۔اس نے دل میں سوچا۔وہ اپنے والدین کو کوستی رہتی۔نکاح کے بعد اس کی برٹش سوشل سکیورٹی ختم ہوگئی تھی۔اب وہ خالی ہاتھ تھی۔اس نے سیم سے پیسے مانگے تو سیم نے اسے جسم فروشی کا کہہ دیا۔

لیکن ایران میں اسکے لیے گاہک ملنا بہت مشکل تھا۔کیونکہ اس دھندے میں موجود ایرانی خواتین بہت خوبصورت تھیں۔برطانیہ میں اس کے زیادہ تر گاہک حبشی تھے۔وہاں اس کا کام چل رہا تھا۔سیم اس

سے شادی کر کے پچھتا رہا تھا بس ایک امید تھی کہ سپاؤ ویزے کے بعد وہ بھی برطانیہ جا سکے گا اسے بھی برٹش نیشنلٹی مل جائے گی۔

سیم ایک سست ، کاہل ،تن آسان اور لاپرواہ آدمی تھا۔زویا من موجی ،خودسر اور بدتمیز عورت تھی۔ساتھ رہتے ہوئے دونوں پر ایک دوسرے کی خامیاں عیاں ہوگئی۔سیم نے زویا کو سوشل میڈیا اکانٹس میں گروپس کا ایڈمن بنا دیا۔وہی زوم میٹنگ کرتی لوگوں کی برین واشنگ کر کے انہیں تنظیم میں شامل کرتی ، پوسٹ لگاتی ، یوٹیوب ویڈیوز بناتی اوراپ لوڈ کرتی ۔اورسیم نے تنظیم کے دفتر کا سارا کام بھی زویا پرڈال دیا۔خودسارادن آوارہ گردی کرتا۔وہ فیس بک ریلز اورٹک ٹاک پرخوبصورت لڑکیاں دیکھ کے آہیں بھرتا رہتا۔اسے زویا مزید بدصورت لگنے لگتی ۔وہ سوچتا کہ زویا بدشکل عورت ہے۔اسے نہ طریقہ ہے نہ سلیقہ۔بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے۔بس اسے اور برداشت نہیں کرونگا۔جب برٹش نیشنلٹی مل جائے گی تو اسے چھوڑ کر کسی خوبصورت خوب سیرت عورت سے شادی کرونگا"

زویا کو سیم کے ضعیف والدین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ ایرانی زبان سے بھی نابلد تھی۔خدمت گزاری اس کے مزاج میں نہیں تھی ۔اکلوتی اولاد ہونے کے باعث اس نے ہمیشہ لاڈ اٹھوائے تھے۔ویسے بھی اسے کونسا ایرانی کوزین پکانا آتی تھی جو وہ ڈشز تیار کر کے ساس سسر اور شوہر کو کھلاتی۔ایرانی لوگوں کا ٹیبل ہمیشہ کھانے سے بھرا رہتا ہے۔نوروز جوان کا تہوار ہے اس تہوار پر ان کے کھانے کے میز پر سات ڈشز میز کی زینت بنتی تھی۔جن کے نام ''س'' سے شروع ہوتے ہیں موسمی پھل بھی ساتھ رکھے جاتے ہیں۔

پھوہڑ زویا کی خوراک ڈبل روٹی انڈوں پر مشتمل تھی اسے کوکنگ نہیں آتی تھی ۔اسے ایرانی کھانوں کا ذائقہ بھی پسند نہیں تھا۔

زویا اب اکیلی ہی آتش کدہ جاتی۔"ڈی سوزا(آتش کدہ کا پجاری)اسے خصوصی اہمیت دیتا اس

نے زویا کو سیم کے خلاف کرنا شروع کر دیا۔زویا پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔

وہ ڈی سوزا کی باتوں میں آ گئی۔ڈی سوزا اسے پیسے بھی دینے لگا۔ایک دن زویا انہی پیسوں سے ضرورت کی چند اشیا لینے بازار گئی تو اس نے سیم کو ایک خوبصورت ایرانی عورت کے ساتھ دیکھا دونوں بہت خوش لگ رہے تھے۔

زویا کے سر سے لگی تو تلوں میں بجھی۔وہ سیدھی ڈی سوزا کے پاس آئی اور اپنا دکھڑا اسے سنایا۔

ڈی سوزا نے جواباً کہا۔

" سیم تو فلرٹ ہے۔تمہارے ساتھ ایک مرتبہ پھر دھوکہ ہو گیا ہے۔تم سے پہلے اس کی کئی گرل فرینڈز تھیں۔وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔وہ ایک دن تمہیں چھوڑ دے گا۔اس سے پہلے کہ وہ تمہیں چھوڑے تم اس کو چھوڑ دو"۔

"تو میں کہاں جاؤں گی"؟ زویا پریشان ہو کر بولی

"اس کا بھی کچھ سوچتے ہیں تم گھر جا کر سیم سے کوئی بات مت کرنا ورنہ تمہارا جھگڑا ہو جائے گا بات مزید بگڑے گی۔''

''اچھا'' کہہ کر زویا گھر چلی آئی۔سیم آدھی رات کو آیا اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔آتے ہی نہانے گھس گیا۔

زویا بستر میں لیٹی سب دیکھ رہی تھی اور اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔چند دن بعد ڈی سوزا نے اسے ایک آفر دی۔

" تمہارے حالات تو بہتر نہیں ہو گے تم ایسا کرو۔پاکستان چلی جاؤ۔وہاں جا کر تنظیم کا کام کرو۔تمہیں تنظیم کی طرف سے رہائش بھی ملے گی اور معاوضہ بھی۔وہاں تمہارے رشتہ دار بھی ہیں۔سوچ لو۔اگر بچہ ہو گیا تو سیم کے ساتھ بندھ جاؤ گی پھر اسے چھوڑنا تمہارے لیے بہت مشکل ہو گا"

زویا یہ سن کے سوچ میں پڑ گی

"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو"۔

ڈی سوزا نے صلاح دی۔

زویا نے چند دن سوچ بچار کی اور ڈی سوزا کی تجویز مان لی۔

ڈی سوزا نے اس کا پاسپورٹ ویزہ کے لیے قونصل خانہ بھیج دیا۔ایک ماہ بعد اس کا ویزہ لگ گیا ڈی سوزا کے ساتھ مل کر اس نے ساری پلاننگ کر لی۔ڈی سوزا نے اسکی ایک ہفتہ بعد کی ٹکٹ کروادی۔ اس کو اچھی خاصی رقم پاکستانی کرنسی کی شکل میں دی۔اس نے پاسپورٹ ،کرنسی اور ٹکٹ ڈی سوزا کے پاس رکھوا دیے۔اس نے جانے سے چار دن پہلے ڈی سوزا سے ملنا چھوڑ دیا۔جب سیم نے پوچھا تو اس نے طبعیت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔

بدشکل عورت بیمار بھی ہوگئی ہے اس نے دل میں سوچا۔

اب اس کی جگہ سیم کو آتش کدہ جانا پڑتا۔آتش کدہ میں تنظیم کے دفتر میں وہ کام کرتا۔فلائٹ والے دن اس نے سیم کے جانے کے بعد پیکنگ کی۔اور ڈی سوزا کی بھیجی ہوئی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ ٹیکسی آ گئی تو اس نے سوٹ کیس گھسیٹا اور ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ٹیکسی اسے ائیر پورٹ لے گئی ائیر پورٹ پر ڈرائیور نے اسے پاسپورٹ ،ٹکٹ اور کرنسی دی۔

وہ جہاز میں سوار ہوگئی۔

پاکستان ائیر پورٹ پر اس کو لینے تنظیم کا اہلکار آیا ہوا تھا۔اہلکار اسے ایک عمارت میں لے آیا جس میں وہ فلیٹ تھا۔جو اسے رہنے کے لیے دیا گیا تھا۔وہ واپس چلا گیا۔زویا نہا دھو کر آرام کرنے لگی کھانا وہ جہاز میں کھا چکی تھی۔اس کا دل چاہا اپنے رشتہ داروں سے رابطہ کرے پھر اس نے سوچا رشتہ تو ماں باپ سے ہے جب ان سے ہی تعلق نہیں رہا تو انکے رشتہ داروں سے کیسا تعلق؟

" چھوڑو۔ دفع کرو سب کو۔ اچھا ہوا سب سے جان چھوٹی۔ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارونگی میں" وہ بڑبڑائی۔

اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑا اور سوگئی۔

☆☆☆☆

سیم گھر واپس آیا تو زویا کو غائب دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا۔ اس کا سوٹ کیس بھی نہیں تھا۔

" کہاں دفع ہوگئی اس شہر میں تو اس کا واقف بھی کوئی نہیں تھا"۔ اس نے خود کلامی کی۔

والدین سے پوچھا انہیں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ پریشان ساڈی سوزا کے پاس چلا آیا۔

ڈی سوزا نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

وہ کئی دن تک زویا کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ اس کے سوشل میڈیا پر لاگ ان ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن زویا کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی یا آسماں نگل گیا تھا۔ اس کا برطانیہ جانے کا خواب چکنا چور ہوگیا۔

ڈی سوزا کو زویا سے ہمدردی نہیں تھی اس نے زویا کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ زویا کے جسمانی اور ظاہری کم صورتی کی وجہ سے کسی مرد کا اس کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ تنظیم اپنی معلومات کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ تنظیم کے ارکان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان جیسے ملک میں اسے کسی بہت قابل اعتماد رکن کی تعیناتی کرنی تھی جو وہاں سب معاملات سنبھال سکتا۔ اس سے پہلے جو رکن وہاں فرائض انجام دے رہا تھا وہ توہین مذہب کے معاملے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک کٹر مذہبی تنظیم کے رکن نے اس کا قتل کیا تھا وہ رکن اس وقت جیل میں تھا اس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ زویا جیسی عورت کی طرف کسی کے متوجہ ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔ تنظیم نے اپنا نیا دفتر بھی ایک بوسیدہ مخدوش عمارت میں قائم کیا تھا۔ تنظیم کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ زویا روزانہ صبح دس بجے دفتر جاتی اور چار بجے لوٹ آتی۔ اس کی زندگی اس کے مطابق گزر رہی تھی۔ دونا کام شادیوں کے تجربے

کے بعد مرد ذات سے نفرت ہو چکی تھی۔

ایک دن صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی وہ بارہ بجے دفتر پہنچی۔وہ دفتر گئی تو دیکھا دفتر کی عمارت منہدم ہو چکی ہے۔دفتر اہلکاروں سمیت زمین بوس ہو چکا ہے۔سارا ریکارڈ ضائع ہو گیا ہے اب اس کا کسی سے رابطہ نہیں تھا۔تنظیم کی پرائیویسی کی وجہ سے وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی۔

وہ خوف زدہ گھر واپس آ گئی۔اس کے شب و روز عالم یاس میں گزرنے لگے۔اس کے پاس موجود رقم بھی ختم ہونے لگی۔

اب کیا کروں اس نے ڈی سوزا کو کئی فون کیے لیکن ڈی سوزا سے رابطہ نہ ہو سکا۔

تنظیم کی طرف سے ڈی سوزا کو اس سے رابطے کا اختیار نہیں تھا۔ڈی سوزا نے اس کا نمبر بلاک کر دیا تھا۔پھر اس نے سوچا سیم کو فون کروں۔

"نہیں نہیں وہ یہاں آ کر میرا جینا حرام کرے گا"

اس سوچ کے تحت اس نے سیم سے بھی رابطہ نہیں کیا۔اس نے جیسے تیسے مکان کو کرایہ ادا کیا اب اس کے پاس چند دن کا راشن بچا تھا پیسے ختم ہو چکے تھے۔

اچانک اس کی طبعیت خراب ہونے لگی۔اسے سینے اور دل پر دبا محسوس ہونے لگا۔اسکے بدن سے پسینہ پھوٹنے لگا اور اس کے بازو میں شدید درد ہونے لگا فون دور چارجنگ پر لگا ہوا تھا۔وہ ایمبولینس کو فون نہ کر سکی۔وہ مدد کے لیے کس کو پکارتی۔

فلیٹ میں تنہائی اس کے ساتھ رہتی تھی۔تنہائی کبھی کسی کی پکار نہیں سنتی کیونکہ تنہائی کے کان نہیں ہوتے۔اس کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

آج اس کا یوم الموت تھا۔

اس کی روح تدریجی طور پر بدن سے پرواز کر رہی تھی۔پاں کے تلووں سے روح کا سفر شروع ہوا

روح آہستہ آہستہ اوپر کی طرف ٹانگوں، گھٹنوں، پیٹ، ناف اور سینے سے گزر رہی تھی اس کی زبان ساکت تھی وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن سانس کی تیز آواز اس کی آواز پر حاوی ہوگئی۔

اس کے نرخرے میں سے خرخر کی آواز آرہی تھی۔ترقی کا مرحلہ کب کا گزر چکا تھا۔

وہ کئی گھنٹے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہی اس کی جان حلقوم میں پھنس گئی۔وہ ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔اس کی پنڈلی اذیت کی وجہ سے مسلسل حرکت کررہی تھی۔اس نے بڑے بڑے فرشتے دیکھے جن سے اسے بہت خوف محسوس ہوا۔کئی گھنٹے بعد وہ سسک سسک کر مرگئی۔اس کی لاش کمرے میں ایک ماہ تک پڑی رہی۔مالک مکان فلیٹ کرایہ وصول کرنے آیا۔اس نے دستک دی کوئی جواب نہ ملا۔اس نے فون کیا کسی نے نہیں اٹھایا۔وہ گھر واپس چلا گیا پھر چار دن بعد آیا تو وہی صورت حال تھی۔اس نے گارڈ سے پوچھا تو گارڈ نے بتایا میڈم کئی دن سے نظر نہیں آئی وہ پولیس کے پاس گیا ساری مسئلہ ان کو بتایا۔پولیس اس کے ساتھ گھر کی تلاشی لینے آ گئی۔پولیس نے دروازہ توڑا تو اندر بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

زویا کی چالیس دن پرانی گلی سڑی لاش ان کے سامنے تھی۔

بستر پر پڑی ہوئی زویا کا پیٹ کیڑوں سے بھرا ہوا تھا کیڑے زویا کی آنتیں کھا رہے تھے۔چیونٹیوں کی قطار بستر سے کمرے کی فرش تک تھی۔زویا کی بے نور پر ہیبت آنکھیں اوپر کو لگی ہوئی تھی منہ کھلا ہوا تھا۔منہ سے کیڑے گلے میں جا رہے تھے۔

پاؤں اور ٹانگیں سوجی ہوئی تھی ان کا رنگ کہیں سے پیلا اور کہیں سے کالا تھا۔چہرہ ایسا ہیبت ناک تھا کہ نظر ڈالنی مشکل تھی۔ایسا خوفناک منظر دیکھ کر اکثر کو جھرجھری آ گئی۔

بستر کی چادر میں لپیٹ کر اس کی لاش کو ایدھی سنٹر میں سرد خانے میں رکھا گیا۔وارثین کی تلاش کے بعد جب کوئی سامنے نہیں آیا تو لاش کو لاوارث قرار دے کر تدفین کر دی گئی۔قونصل خانہ سے ان کے نمائندے نے تدفین میں شرکت کی۔زویا اپنے والدین سے بہت دور مرگئی۔اکیلی، تنہا اور دفن بھی

ہوگئی ۔جس برحق دین کو اس نے ترک کر دیا تھا اس کی آخری رسومات بھی اسی دین کے مطابق ادا کی گئیں ۔اس کی تدفین اسلامی طریقے پر کی گئی ۔اس کا نیا دین نہ خوشی میں اس کا ساتھ دے سکا نہ غمی میں ۔کوئی محرم اسے قبر میں نہ اتار سکا۔نامحرم افراد اس کے جنازے کے ساتھ چلے۔

اس کی قبر پر دعا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔دعا تو اللہ کو ماننے والے کرتے ہیں ۔نہ اس کے گھر پر پرسہ دینے والوں کا ہجوم تھا۔نہ فاتحہ،خوانی،نہ رسم قل،نہ چہلم۔وہ گمراہ ہوگئی تھی جو گمراہ ہو جائیں ان کی طرف جانے والے سارے راستے گم ہو جاتے ہیں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

حرماں نصیب

پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی گلی میں دو بچے کھیل رہے تھے۔گلی میں دھول اور مٹی اڑ رہی تھی۔درختوں کے وجود سے پاک گلی میں سایہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔گرمیوں کے دن تھے بارہ بجے کا وقت تھا۔بچپن گرمی سردی سے بے نیاز ہوتا ہے دونوں بچے ننگے کھیل رہے تھے۔انکی عمریں بالترتیب چار اور پانچ سال تھی۔بچوں کے چہروں سے عسرت ٹپک رہی تھی۔ساندل بار کے علاقے کا یہ گاں مالٹے کے باغوں ،گندم،کپاس،سرسوں کی فصل کے لیے مشہور تھا۔چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں سکھوں کے زمانے کا بنا ہوا یہ گاں بہت خوب صورت اور کشادہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد شکیلہ باہر آئی اور اپنے دونوں بیٹوں کو گھر کے اندر لے گئی۔گھر کیا تھا بیرونی دروازے سے چار فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا ایک صحن یا دیوڑھی،دو کمرے،ایک غسل خانہ اور کچن پر مشتمل چار مرلہ کا مکان تھا۔

کبھی یہ مکان دس کنال اور پھر وراثتی تقسیم کے بعد دو کنال اب چار مرلہ پر محیط رہ گیا تھا۔چار دہائیوں میں مکان کی مسلسل کٹوتی نے مکینوں کی زندگی سے خوشیوں اور سکون کی کٹوتی بھی کر دی تھی۔

ایسی ہی جون کی ایک گرمیوں بھری سہ پہر تھی۔شدید گرمی تھی اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ننھی شکیلہ جس کی عمر دس برس تھی اسے گھر میں سکون نہیں مل رہا تھا۔بجلی بند تھی جس سے برا حال تھا۔وہ قریبی کریانہ کی دکان سے کوئی کھٹی میٹھی چیجی (چیز) لے کر کھانا چاہتی تھی۔لیکن ماں کے ڈر سے چارپائی پر لیٹی ہوئی

تھی ۔اس کی ماں صغراں انتہائی تیز اور گھنی عورت تھی ۔اسکی جوانی کی خوبصورتی نامساعد حالات نے نچوڑ لی تھی ۔گورا رنگ دھوپ میں کام کرتے ہوئے سنولا گیا تھا بھرا بھرا متناسب سراپا ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کی چار بیٹیاں تھیں بڑی بیٹی عقیلہ دسویں میں زیر تعلیم تھی اس سے چھوٹی سبیلہ اسکول نہیں جاتی تھی ۔کیونکہ وہ پیدائشی طور پر ذہنی معذور، گونگی اور بہری تھی ۔منہ میں انگوٹھا لے کر ماں کے جہیز کی پرانی کرسی پر سارا دن بیٹھی رہتی ۔اس کی ضروریات کا خیال بھی صغراں کو رکھنا پڑتا تھا۔اسے نہلانا ، دھلانا کپڑے بدلنا، کھانا کھلانا صغراں کی ذمہ داری تھی ۔

اس سے چھوٹی بیٹی رمیلہ ساتویں میں تھی اور سب سے چھوٹی شکیلہ چوتھی جماعت کی طالبہ تھی ۔

شکیلہ سے گھر کے افراد کو کوئی دلچسپی نہ تھی وہ ایک بے کار فالتو شے تھی ۔صغراں کی بیٹے کی شدید خواہش نے اسے بیٹیوں کی قطار دی تھی جن سے وہ ناخوش تو نہ تھی لیکن مطمئن بھی نہیں تھی ۔

جس وقت صغراں بیاہ کر سسرال آئی ۔یہ چار مرلہ کا مکان دس کنال کے کشادہ دیہاتی مکان کی مثل تھا۔جس کے بڑے صحن میں درخت لگے ہوئے تھے اور پکی اینٹوں سے بنے پلستر زدہ کمرے دیواروں کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے ۔ایک بڑا کمرہ صغراں کو دے دیا گیا۔صغراں کی ماں محمد بی بی بہت ہوشیار عورت تھی اس نے صغراں کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا۔دونواڑی پلنگ، چار لکڑی کی کرسیاں بمعہ میز، بید سے بنی ہوئی پیڑھیاں، فار میکے والا سنگھار میز،

دو پیٹیاں ،اسٹیل کے برتن، شنیل کی رضائیاں اور کپاس کی روئی کے گدے، ملتانی کھیس ، پانچ تولے زیور، سسرال والوں کے پہناوں کے لیے جاپانی کے ٹی کے تھان اس نے اپنے سعودی عرب والے بیٹے سے منگوائے تھے ۔پھر نک چڑھی بہو سے نکلوائے ۔عورتوں کے لیے ریشمی سوٹ پشاور کے باڑے سے منگوائے ۔صغراں کا جہیز دیکھ کر سارا گاں واہ واہ کرتا تھا۔صغراں کا سسر بڑا زمیندار تھا۔دس

کنال کے کشادہ مکان میں مویشیوں کے لیے الگ احاطہ تھا دو مربع زمین بھی تھی۔ بس صغراں کا شوہر بہت بدصورت تھا۔ سب سسرال والے ہی بہت گہری رنگت کے مالک تھے۔ انکے مقابلے میں صغراں کے گھر والے بہت خوبصورت تھے۔ سسرال والوں نے صغراں کی خوبصورتی کو دیکھ کر رشتہ لیا تھا جہیز ان کے لیے بونس آئٹم تھا۔

صغراں بھی اپنے نام کی ایک تھی چند دن بعد ہی شوہر کو لے کر الگ ہوگئی۔ سسر نے مکان میں دیوار کر کے دو کنال کا حصہ ان کو دے دیا۔ اور بیٹے کے حصے کی زمین بھی اسے دے دی جس پر کریم بخش کھیت باڑی کرنے لگا۔ انہیں ملنے والے رہائشی حصے میں دو کیکر کے درخت ایک بیٹھک جو صغراں کے جہیز سے بھری ہوئی تھی اور دو کوٹھری نما چھوٹے کمرے آئے۔ اب صغراں سارا دن ماں کے گھر رہتی ماں کے گھر کے سارے کام کرتی اور سسرال والوں کو خاطر میں نہ لاتی۔ شوہر اس کا بے دام کا غلام تھا۔ صغراں کی سفید رنگت اور خوبصورتی نے اسے مجنوں بنا رکھا تھا۔

بیٹیاں جوان ہونے لگی تو ان کے بیاہ کے لیے صغراں نے اپنے شوہر کریم بخش کو مال کمانے کے لیے سعودی عرب بھیج دیا۔ اس کے لیے اس نے کریم بخش کی وراثتی زمین کا ایک ٹکرا فروخت کیا۔ شومئی قسمت سعودی عرب پہنچ کے کریم بخش کا کفیل بگڑ گیا اور کریم بخش کو جیل ہوگئی۔

اب صغراں کا ذریعہ آمدنی تو زمین سے ہونے والی کمائی تھی۔ جو کرنے والا کریم بخش تھا۔ صغراں نے گزر بسر کے لیے زمین کا ایک اور حصہ فروخت کر دیا۔

اسی پریشانی میں شب و روز گزر رہے تھے ایسے میں بیٹیوں کا اسے کہاں ہوش تھا۔ شکیلہ نے جب دیکھا کہ ماں باپ کا فون سننے اس کی چاچی کے گھر ساتھ والی گلی میں گئی ہے تو وہ ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دبائے شیدے کی دکان پر جا پہنچی۔ اسے دیکھ کر شیدے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

تو اتنی دوپہرے خیر ہے؟ شیدے نے پوچھا۔

مجھے چیز لینی ہے شکیلہ بولی۔

پہلے کچھ ٹھنڈا پی لے گرمی بوہت ہے۔

شیدے نے فریزر سے بوتل نکال کر اسے تھمائی۔

اس نے جلدی جلدی بوتل ختم کی اور مطلوبہ سامان پکڑ کے گھر کو بھاگی۔

" شکر ہے ابھی اماں نہیں آئی۔ باتیں کرنے بیٹھ گئی ہوگی۔"

وہ بہنوں سے چھپ کر چیزیں کھانے لگی۔

پھر وہ شیدے کے بارے میں سوچنے لگی شیدا کتنا اچھا ہے۔ مجھے ٹھنڈی بوتل بھی پلائی۔

تھوڑی دیر بعد صغراں آ گئی۔ اور بیٹی سے کہنے لگی۔

" عقیلہ اٹھ کر صفائی کر لے سارا صحن مٹی سے اٹا پڑا ہے۔

" اتنا بڑا صحن ہے مجھ سے نہیں صاف ہوتا۔ عقیلہ نے جوابا کہا۔

" ساتھ شکیلہ کو لگا لے "۔ صغراں نے عقل دی۔

" اچھا اماں "

تھوڑی دیر بعد دونوں نے مل کر کچے صحن میں پانی چھڑکا اور جھاڑو لگانے لگی۔ صغراں چولہے پر بیٹھ کر شام کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

دو دن گزر گئے شکیلہ کے پاس پیسے نہیں تھے وہ گلی میں کھیل رہی تھی کہ شیدے کا گزر ہوا۔ اسے دیکھ کر بولا۔

" کیوں ری تو ہٹی پر کیوں نہیں آتی "

" ویسے ہی " شکیلہ بولی۔

" جب چیز کو دل کرے آ جانا پیسے نہیں لونگا تجھ سے " شیدا شکیلہ کا گال مروڑ کر بولا۔

سچ شکیلہ حیرت سے بولی۔

"ہاں سچ" شیدے نے کہا

اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

شکیلہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

شیدا پچیس سال کا جوان آدمی تھا اس کے دو بچے تھے بیوی سادہ سی عورت تھی۔

اب شکیلہ کا دل کھیل میں نہیں لگ رہا تھا وہ کھیل چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ جیسے تیسے اس نے رات گزاری، ناشتہ کیا دس بجے کے قریب ماں کی نظروں سے بچ کر دروازہ کھول کر چپکے سے نکل گئی۔

اسے آتا دیکھ کر شیدے کی باچھیں کھل گئی۔

" کیا لے گی تو" اس نے پوچھا

شکیلہ للچائی ہوئی نظروں سے چیزوں کو باری باری دیکھنے لگی۔

"جو لینا ہے لے لے"

اس نے ٹافیوں چیونگم اور چپس کے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا

شیدے نے مٹھی بھر بھر کر ایک بڑا شاپر تیار کر دیا۔

"یہ سب میرا ہے" شکیلہ خوشی سے بولی

"ہاں تیرا ہے لیکن کسی کو مت بتانا پھر باقی لڑکیاں بھی لینے آ جائیں گی"۔

"ٹھیک ہے"

یہ کہہ کر شکیلہ بھاگ گئی۔ گھر کے راستے میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ مزے لے لے کر چپس کھانے لگی۔

اس نے پندرہ منٹ میں شاپر ختم کیا منہ ہاتھ صاف کیا اور گھر کی راہ لی۔

اب تو یہ شکیلہ کا معمول بن گیا جونہی موقع ملتا وہ شیدے کی دکان کی راہ لیتی۔ مالِ مفت بٹورتی اور شکم سیری کرتی۔

"تو دوپہر کے وقت آیا کر اس وقت رش کم ہوتا ہے" شیدے صلاح دی۔

"اس وقت تو بہت گرمی ہوتی ہے" شکیلہ بولی۔

"لے گرمی سے کیا ڈرنا تجھے ٹھنڈی بوتل پلانگا۔ ساری گرمی اڑ جائے گی"۔

"چلو ٹھیک ہے کل آونگی تین بجے" شکیلہ یہ کہہ کر گھر آ گئی۔

تپتی ہوئی دوپہر میں ہر طرف لو چل رہی تھی۔ گلیاں سنسان تھیں چرند پرند گرمی کی شدت سے نڈھال تھے۔ ہوا ایسے ساکن تھی کہ جیسے کہیں چھپ کر بیٹھی ہو۔

ایسے میں شکیلہ لہراتی، بل کھاتی، چھلانگیں لگاتی شیدے کی دکان پر جا پہنچی۔

شکیلہ کو دیکھ کر شیدا بولا

"پچھلے دروازے سے آ جا"

اور اس نے دکان کا شٹر گرا دیا۔

دکان کے پیچھے ایک اسٹور نما کمرہ تھا جس کا دروازہ پیچھے کی طرف باہر کھلتا تھا۔ کچا پکا یہ کمرے اضافی سامان رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس میں ایک چارپائی بھی رکھی ہوئی تھی جس پر شیدا دوپہر کے وقت کمر سیدھی کرتا تھا شکیلہ اس دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

"دکان کا شٹر کیوں گرا دیا" شکیلہ نے پوچھا

" گرمی ہے نا" شیدا بولا

اس نے شکیلہ کو گود میں بٹھا لیا اور ٹھنڈی بوتل پکڑا دی۔ شکیلہ بوتل پینے لگی۔ اور اسٹور کا جائزہ لینے لگی چیزوں سے بھری بوریاں، کنستر اور تھیلے دیکھ کر اسکی رال ٹپکنے لگی۔

" کیا دیکھ رہی ہے سب ترا ہے جو چیز مانگے گی دونگا"

یہ کہہ کر شیدے نے اسے گود سے اتارا اور شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزیں دینے لگا۔

شکیلہ نے خوب کھایا جب اس کی بس ہوگئی تو چار پائی پر لیٹ گئی۔ شیدا اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔

"تو تھک گئی ہوگی"

شکیلہ کی ٹانگیں تو کبھی اسکی ماں نے نہیں دبائے تھی۔ اسے سکون سا محسوس ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تو بہت اچھا ہے شیدے انکل"

شیدے نے بازو پھیلا کر شکیلہ کو گود میں اٹھالیا۔

رفتہ رفتہ شکیلہ شیدے سے اس قدر مانوس ہوگئی کہ اس کی کسی بات سے انکار کرنے کی اس کی ہمت نہ ہوتی۔ دو گھنٹے شیدے کے ساتھ گزار کر کھا پی کر وہ گھر واپس آ گئی۔

اب تو شکیلہ کا یہ معمول بن گیا۔ جو توجہ اسے گھر سے نہ مل سکی وہ شیدے سے ملنے لگی۔

پھر ایک دن وہ پکڑی گئی صغراں نے اس کی خوب مار لگائی۔

" کہاں جاتی ہے تو روزانہ دوپہر کو"

شکیلہ نے مار کھالی لیکن لب نہ کھولے۔

چھٹیاں ختم ہوئی اسکول کھل گئے۔ معمولات بدل گئے۔

شیدے اور شکیلہ کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی کچھ عرصے کے لیے رک گیا کہ کریم بخش سعودی عرب سے واپس آ گیا وہ ٹی بی کا مرض پردیس سے تحفہ لے کر آیا تھا۔ سارا دن پڑا کھانستا رہتا۔ محنت مشقت کی اب اس کے بدن میں طاقت نہیں رہی تھی۔

شکیلہ اور شیدے کی چوری چھپے ملاقاتیں جاری تھیں۔

صغراں نے بڑی بیٹی کی شادی کر دی۔ مزید زمین بیچی گئی اور فرض ادا کیا گیا۔

اب تو اس خاندان کا ذریعہ معاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین بیچنا ہی رہ گیا تھا۔

صغراں کے والدین وفات پا چکے تھے بھابھیاں منہ نہیں لگاتی تھی۔اسے کسی سے مدد کی امید نہیں تھی۔اسی دوران کریم بخش کو دل کا مرض ہو گیا۔جو بچی کچی زمین تھی وہ بیچ دی گئی اور بائے پاس آپریشن کروالیا گیا۔

اب کریم بخش زمین دار نہیں رہا تھا جائیداد کے نام پر اس کے پاس صرف یہ مکان بچا تھا دو کنال پر محیط دیہاتی مکان۔اس عرصے میں شکیلہ نے میٹرک پاس کر لیا۔

شیدے کی آمدورفت شکیلہ کے گھر بڑھنے لگی وہ سودا سلف لانے لگا کبھی گھی،کبھی آٹا،کبھی چینی۔ کریم بخش کو نہ چاہتے ہوئے اس کا احسان لینا پڑتا۔صغراں لوگوں کے کھیتوں میں محنت مزدوری کرنے لگی۔لوگ زکوت،صدقہ،خیرات دینے لگے۔

دوسری بیٹی تو شادی سے قاصر تھی لیکن تیسری کی عمر شادی کی ہو چکی تھی۔صغراں نے مکان میں سے دس مرلہ صحن کا رقبہ بیچ دیا۔مکان تیس مرلہ رہ گیا۔

بیٹی کی رخصتی کے بعد صغراں کے شوہر کو فالج کا اٹیک ہو گیا۔اور وہ بستر پر پڑ گیا۔صغراں گھر سے باہر کھیتوں میں مزدوری کرنے جاتی تھی۔گھر پر صرف معذور سبیلہ تھی شکیلہ اور باپ تھے۔شکیلہ نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی جن چکروں میں وہ لڑکپن میں پڑ گئی تھی وہ اسے کتابوں سے کہاں دل لگانے دیتے تھے۔اس نے شیدے سے دل لگا لیا تھا جو اسکی جسمانی جذباتی اور مالی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔

اب شیدے نے شکیلہ کو موبائل لے دیا وہ موقع دیکھ کر گرین سگنل دے دیتی۔شیدا پہنچ جاتا دونوں مل کر منہ کالا کرتے۔

ایمرجنسی کے لیے شیدے نے شکیلہ کو نیند کی گولیاں دے رکھی تھی۔

یہ ایمرجنسی ان دنوں پیش آتی جب فصلوں کی کٹائی کا موسم گزر جاتا تو صغراں گھر پر ہوتی۔

شکیلہ ماں باپ کو نیند کی گولیاں ناشتے میں دے دیتی وہ دونوں سو جاتے اور یہ دونوں عیاشی کرتے رہتے۔

ایسے ہی ایک دن جب شکیلہ نے نیند کی گولیاں والدین کی چائے میں ملا کر والدین کو پلائی تو اس سے چوک ہو گئی۔

ایک جیسی دو بوتلیں شیدے نے اسے دے رکھی تھی جس میں سے ایک میں نیند کی چھوٹی سفید گولیاں تھیں دوسری میں فیملی پلاننگ کی اکیس سفید چھوٹی گولیاں اور سات براون گولیاں تھیں۔ براون گولیاں شکیلہ کھا چکی تھی اب تو اس کے سیف دن چل رہے تھے اسی لیے اس نے شیدے کو بلایا تھا۔

گولیاں ڈبوں سے نکال کر بوتلوں میں رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو اصلیت کا علم نہ ہونے پائے۔ ڈبا کسی کی نظر میں آئے تو کوئی بہانہ بنا دیا جائے۔

براون گولیاں چونکہ ختم ہو چکی تھی سفید فیملی پلاننگ کی گولیاں شکیلہ نے نیند کی گولیاں سمجھ کر چائے میں ملا دی۔

صغراں اور اس کا شوہر رات بھر نہیں سو پائے تھے بجلی کی آنکھ مچولی نے انہیں جگائے رکھا تھا ناشتہ کیا تو شکم سیری سے نیند آ گئی اور وہ سو گئے شکیلہ سمجھی کہ نیند کی گولیوں کا اثر شروع ہو چکا ہے اس نے شیدے کو کال کر کے بلا لیا۔ والدین کے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور دونوں ساتھ والے کمرے میں گھس گئے سبیلہ کی چارپائی بھی صغراں کے کمرے میں تھی وہ بے زبان لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد صغراں کی آنکھ کھلی اور وہ پانی پینے کے لیے اٹھی۔ ساتھ والے کمرے سے گزرنے لگی تو مرد کی آواز سن کر ٹھٹھک گئی۔

"ارے وہ تو ترے قدموں کی خاک بھی نہیں ہے۔ تو تو شہزادی ہے شہزادی"

شیدا لگاوٹ سے کہہ رہا تھا۔

جواباً شکیلہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"چل جھوٹا پھر اسے چھوڑ دے"

" کیسے چھوڑ دوں میرے پانچ بچوں کی ماں ہے"۔شیدا بولا۔

صغراں بچاری حیران پریشان رہ گئی اس کا دل چاہا اندر جا کر دونوں کو رنگے ہاتھ پکڑے۔اس نے ایک قدم بڑھایا تھا کہ ان دونوں کی عریاں ٹانگوں پر اس کی نظر پڑی شرم کے مارے وہیں سے وہ واپس پلٹ آئی۔اور بے دم سا ہو کر چارپائی پر گر گئی پیاس اڑ گئی۔" کاش میں مر جاتی یہ دیکھنے سے پہلے"

وہ خاموشی سے رونے لگی۔

تو شیدے کی عنایات کی یہ وجہ تھی۔

"بے غیرت تو میری بیٹی ہے غیر سے کیا شکوہ"

وہ دل ہی دل میں خود سے بولی۔

اتنے میں دونوں دروازے کے باہر سے گزرے الوداعی بوسوں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔اور شیدا رخصت ہو گیا۔

شور مچانے سے اپنی ہی بدنامی ہو گی۔

صغراں نے چادر لی اور رشتے کرانے والی کے گھر جا پہنچی اسے شکیلہ کے رشتے کا کہا۔

رشتے والی نے چند دن بعد صغراں کی ذات کا ایک رشتہ بتا دیا۔

لڑکا شارجہ میں ملازم تھا گھر پر اسکے والدین اور دو کنواری بہنیں تھیں۔

انہوں نے غربت دیکھ کر شکیلہ کو پسند کر لیا کہ ہم سے دب کر رہے گی۔انہیں کیا خبر تھی کہ شکیلہ تو پہنچی ہوئی چیز ہے۔

شکیلہ کی ماں لڑکے کی باہر کی کمائی پر ریجھ گئی۔لڑکے کی بہنیں اسکول میں استانیاں لگی ہوئی تھی۔ دونوں بہنیں ایم اے پاس تھیں۔صبح تیار ہو کر اسکول چلی جاتی۔بچوں کے ساتھ ساتھ سارا دن کھپا کر تھکی ہوئی گھر واپس لوٹتی۔ پرائیوٹ اسکول والے تو استانیوں کا لہو نچوڑ لیتے ہیں۔شکیلہ کے انتخاب کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ کم پڑھی لکھی اور غریب گھر دے ہے۔سارے گھر کا کام سنبھالے گی۔ساس سسر کی خدمت کرے گی۔لیکن شکیلہ تو گناہ کی پوٹ تھی۔

اس کے شرافت کے جراثیم بچپن ہی میں شیدے نے مار دیے تھے۔

شکیلہ گھبرائی ہوئی شیدے کی دکان پر جا پہنچی۔اور سارا قصہ سنایا۔

تو کر لے شادی۔ دیکھ میری شہزادی میں تجھ سے شادی نہیں کرسکتا میری لڑکیاں جوان ہیں۔تو شادی کر لے۔شوہر ترا باہر ہوگا ملاقاتیں کرتے رہیں گے ہم دونوں۔فکر نہ کر۔اسکے پیسوں پر عیش کرنا مجھے بھی باہر کے تحفے دے گی ناں تو"۔

شیدے نے سمجھایا اور شکیلہ مان گئی۔

شکیلہ کی منگنی ہوگئی۔

صغراں نے پانچ مرلہ جگہ مکان میں سے فروخت کی اور شکیلہ کی شادی کردی۔

شکیلہ کا سسرالی گھر بہت بڑا تھا۔اس کے سسر کی زرعی زمین بھی تھی۔شکیلہ کے مائیکے کے مقابلے میں یہ لوگ خاصے خوشحال تھے۔شکیلہ کا سسر آرمی کا ریٹائرڈ حوالدار تھا۔وہ پینشن بھی لیتا تھا اور اسے صادق آباد میں دو مربع زمین بھی آرمی سے ملی تھی۔شکیلہ کا شوہر بھی دس سال سے شارجہ میں ملازمت کررہا تھا۔سب سہولتیں دستیاب تھیں۔کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں تھی۔شکیلہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنے نصیب پر رشک کرتی۔جن معمولی روزمرہ کی ضروریات زندگی کے لیے وہ ماں کے گھر ترستی تھی اور شیدے کی جسمانی ضرورت پوری کرتی تھی وہ یہاں وافر مقدار میں دستیاب تھیں۔

شکیلہ کا شوہر اصغر علی گھاگ مرد تھا۔

اسے شکیلہ کی حرکات وسکنات پر پہلے دن سے ہی شک ہو گیا۔

"تو کنواری تو نہیں لگتی۔" اصغر علی غور سے شکیلہ کے منہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

" کیا مطلب ہے آپ کا میری پہلی شادی ہے"

"وہ تو ہے۔لیکن کنواریوں والی لاج نہیں تجھ میں۔"

اصغر علی نے کہا۔

آپ کو کتنی کنواریوں کا تجربہ ہے"۔شکیلہ نے جواب دیا۔

وہ چپ کر گیا لیکن اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔مہینے کی چھٹی ختم ہوئی اور اصغر علی ایک سال کے لیے شارجہ چلا گیا۔

شکیلہ ماں کے گھر آ گئی۔اس نے رات کو گولیاں والدین کو کھلائی اور ساری رات شیدے کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی۔

اسے اپنے موجودہ شوہر سے کوئی رغبت نہیں تھی تو سسرال والوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔وہ تو اس ماں کی بیٹی تھی جس نے سسرال کو کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ایک ہفتے بعد شکیلہ کو سسرال جانا پڑا۔ساس نندوں نے چند دن بعد گھر کا کام اس پر ڈال دیا۔جو شکیلہ کو بہت ناگوار گزرا۔اب وہ شوہر سے ضد کرنے لگی کہ ماں کے گھر رہونگی مجھ سے کام نہیں ہوتا۔پھر ذاتی خرچ کا مطالبہ بھی شروع کر دیا۔تین مہینے بعد اس کا پاؤں بھاری ہو گیا۔

اب تو مزید مزاج بگڑ گیا۔

ماں کو فون کر کے بلاوا بھیجا اور وہ آ کر شکیلہ کو لے گئی۔

گھر پہنچ کر وہ شیدے سے ملنے کی تدبیر کرنے لگی۔

چند دن گزرے تو اسے الٹیاں شروع ہوگئی اب بوتل پینے کے بہانے شیدے کی دکان پر جانے لگی۔ملاقاتوں کے لیے کوئی جگہ نہ ملی تو شیدے نے بیوی کو مائیکے بھیج دیا۔

شکیلہ کو اپنی ماں کے رویے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شیدے کے بارے میں جان گئی ہے اس لیے اب گھر پر ملنے پر شکیلہ آمادہ نہیں تھی۔شیدے کے گھر دونوں کی ملاقات ہوگئی صغراں فوتگی پر دوسرے شہر گئی ہوئی تھی۔دونوں نے چار گھنٹے ساتھ گزارے۔صغراں کے لوٹ آنے سے پہلے شکیلہ آ گئی اور گھر کا کام کرنے لگی تا کہ ماں کو شک نہ ہو۔اصغر علی شکیلہ پر سسرال واپسی کا دبا ڈالنے لگا۔چارو نا چار شکیلہ واپس چلی گئی۔مجبورا سسرال میں گزارہ کرنے لگی۔

ڈیلیوری سے پہلے وہ ماں کے گھر آ گئی۔قدرت نے اسے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔لیکن شکیلہ نے ناشکری سے کام لیا۔اور اپنی اصلاح نہ کی۔وہ سوا مہینہ پورا ہوتے ہی شیدے سے ملاقات کا طریقہ سوچنے لگی۔اچانک سبیلہ کی طبعیت بگڑ گئی اسے سانس کا مسئلہ ہوگیا ماں اسے لے کر ایمرجنسی میں بھاگی۔باپ کو شکیلہ نے نیند کی دوائی دی اور شیدے کو بلا لیا۔

"میں اصغر علی سے طلاق لے لوں تو تو مجھ سے شادی کرلے گا شیدے"۔

شکیلہ نے بڑی آس سے پوچھا۔

"تو کیوں اس سے طلاق لے گی" شیدے نے کہا۔

"وہ مجھے زہر لگتا ہے"

"سال بعد مہینے کی چھٹی آتا ہے برداشت کرلے"

" کیا برداشت کروں۔خرچہ مجھے نہیں دیتا۔اسکی ماں بہنیں نوکر بنا کر رکھتی ہیں۔ماں کے گھر رہنے نہیں دیتا۔شکیلہ بولی۔

"تو فکر نہ کر۔بیٹے کا منہ دیکھ کر اس کا دل نرم پڑ جائے گا۔تری باتیں مان لے گا۔چل اب موڈ

خراب نہ کر۔ ادھر آ۔"

شیدے نے شکیلہ کو اپنی طرف کھینچا۔ چند دن بعد اصغر علی آ گیا۔ بیٹا دو مہینے کا ہو چکا تھا۔

شکیلہ کو مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق سسرال جانا پڑا۔ اصغر علی کے باپ نے پوتے کا عقیقے دھوم دھام سے کیا۔ میٹھے نمکین چاولوں کی دیگیں، گوشت کا سالن نان۔

شادی جتنا خرچہ کیا گیا۔ صغراں بھی سب کے کپڑے بنا کر لائی۔ سمدھی، سمدھن، داماد پوتا اور نندوں کے جوڑے ساتھ مٹھائی۔ بیٹی کے لیے بھی اس نے سونے کی بالیاں اور کپڑے بنوائے۔

یہ سارا خرچہ اس نے کمیٹی کے پیسوں سے کیا۔ دو سال کی بچت بیٹی کا گھر بسانے پر لگا دی۔

عقیقے میں آئے ہوئے مہمانوں میں سے ایک نے مذاقاً کہہ دیا۔

یار اصغر ترا بیٹا تجھ سے نہیں ملتا"۔ اصغر کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی۔

اس نے اپنی ماں سے یہ تذکرہ کیا تو وہ بھلی مانس عورت بولی: "پتر بچے کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ کاکا بڑا ہو گا تو اصل شکل پتا چلے گی۔"

ایک مہینہ گزر گیا اور اصغر علی واپس چلا گیا۔

شکیلہ کے ساس نندوں سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ نندوں کی اسکول سے واپسی پر اس نے کھانا تیار کرنے سے انکار کر دیا۔ ساس اسے نا قابل برداشت ہو گئی۔ سسر اسے زہر لگتا۔ اسے شیدا بھی یاد آتا۔ اس کی قربت کا نشہ اسے بے قرار رکھتا۔ جب موقع ملتا فون پر بات کر لیتی۔ مگر بات سے کہاں اس کا دل بھرتا ملاقات کی طلب رہتی۔ ایک دن شیدے سے فون پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے شکیلہ کے سسر نے اسے سن لیا۔ اسے شکیلہ کی اس حرکت پر بہت طیش آیا لیکن بیٹے اور پوتے کی وجہ سے چپ کر گیا۔

اب اس نے بیٹے پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ پاکستان آ کر رہے یا شکیلہ کو شارجہ بلا لے۔ اصغر علی نے اپنی مجبوریوں کا جواز پیش کر دیا اور باپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ کاکا چار ماہ کا ہو گیا تو شکیلہ کو

پتا چلا کہ اس کا پاں ایک دفعہ پھر بھاری ہو گیا ہے۔

"ابھی تو کا کا چھوٹا ہے تو کوئی احتیاط کر لیتی۔" شکیلہ کی ماں خوشخبری سن کر بولی۔

اصغر علی سے ذکر کیا تو وہ چپ ہو گیا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی" شکیلہ حیران ہوئی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

شکیلہ نے شیدے کو بتایا تو وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"میرا ہے یا ترے خصم کا"

"بڑا بے شرم ہے تو" شکیلہ بولی۔

شکیلہ کو بہانہ مل گیا ماں کے گھر جانے کی ضد کرنے لگی۔ سسر نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔

لیکن شکیلہ کہاں رکنے والی تھی۔ وہ لڑ جھگڑ کر ماں کے گھر آ گئی۔ شیدے سے ملاقاتیں بھی شروع ہو گئی اور شکیلہ کا باپ جو فالج کا مریض تھا وہ بھی دنیا سے گزر گیا۔

صغراں پریشان بے حال بیٹھی تھی۔ ایک طرف بیوگی کا غم دوسری طرف بیٹی کا سیاپا۔ کہ شکیلہ کے دونوں بہنوئی مکان میں سے حصہ مانگنے لگے۔ وقتاً فوقتاً مکان کے حصے بخرے کر کے بیچے گئے۔ بیٹیوں کو حصے دے کر جو کچھ بچا اس میں شکیلہ، شکیلہ کی ماں اور سبیلہ کا حصہ رہ گیا تھا جو ٹوٹل دس مرلہ تھا۔

شکیلہ نے بیٹے کو جنم دیا۔ اور سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔

شوہر سے خرچے کا مطالبہ کیا جو اسے ماں کے گھر میں رہ کر ملنا چاہیے۔ یہ بات اصغر علی نہیں مانا۔

لڑائی بڑھ گئی معاملہ کورٹ کچہری تک پہنچ گیا۔ شکیلہ کی ماں نے اپنا اور سبیلہ کا حصہ بیچا اور مقدمہ لڑنے لگی۔ اب مکان کا رقبہ چار مرلہ رہ گیا تھا جو کہ شکیلہ کی ملکیت طے پایا۔ اور شکیلہ کے نام کر دیا گیا۔ تا کہ داماد مزید حصہ نہ مانگ سکیں۔

شکیلہ کو طلاق ہوگئی۔

شکیلہ اور بچوں کا خرچہ عدالت نے اصغر علی کے ذمے لگایا۔ ہر مہینے شکیلہ کو بیس ہزار خرچہ عدالت سے ملنے لگا۔اسکا ماں کے گھر رہنے کا شوق پورا ہو رہا تھا۔گزر بسر چل رہی تھی ۔اجڑنے کا شکیلہ کو کوئی غم نہ تھا۔اس کے دن عید اور راتیں شب راتوں میں تبدیل ہو چکی تھی شیدے کے جادو نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔صغراں نے بھی اس کے ناجائز تعلق کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ وہ بیٹی کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی۔اصغر علی کے سارے خاندان کو بددعائیں دیتی رہتی۔

سال گزر گیا تو اصغر علی چھٹی پاکستان آیا ایک زیرک وکیل کے مشورے سے وہ شکیلہ کے خرچے والا کیس دوسرے شہر لے گیا۔ ماہوار خرچہ بند ہوگیا اب شیدے کی مدد سے گھر کا خرچہ چل رہا تھا ۔شیدے نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شکیلہ کے لیے تگڑا وکیل کرے گا کہ اچانک شیدے کی دکان میں آگ لگ گئی۔سب مال جل گیا۔دکان راکھ کا ڈھیر بن گئی۔شیدے کو کھانے کے لالے پڑ گئے۔

اس کی بیٹیوں کی شادی سر پر تھی ۔جیسے تیسے بیٹیوں کو رخصت کیا اب شیدے کو عشق محبت اور شکیلہ بھول گئی۔اس کے گناہ کی نحوست اس کی دکان کو کھا گئی۔

اس نے شکیلہ کا نمبر بلاک کر دیا۔شکیلہ پریشان ہو کر شیدے سے ملنے جلی ہوئی دکان پر پہنچی تو شیدے نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کر دو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔آئندہ مجھ سے رابطہ مت کرنا"۔

شکیلہ دھوبی کے کتے کی مانند نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی ۔مقدمہ لڑنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھی ۔آخری پونجی مکان تھا جسے بیچنا اب ممکن نہیں تھا۔مکان بیچنے کی صورت میں ماں بیٹیاں اور بچے سڑک پر آ جاتے۔غربت، بدکاری کی نحوست، مکاری اور لالچ کی چکی شکیلہ کے خاندان کو پیسنے لگی۔

اسکے بچے بھوکے پیاسے گلی میں کھیلتے رہتے۔بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے شکیلہ کے پاس پیسے نہیں

تھے۔اصغر علی کبھی بچوں سے ملنے نہیں آیا۔شکیلہ کی ماں محنت مزدوری کر کے مانگ تانگ کر گھر کی گاڑی چلاتی ۔شکیلہ کی عیاشی اور بے راہ روی نے اس کے بچوں کو یتیم مسکین اور محتاج بنا دیا تھا۔صبر شکر کا پھل دیر سے ملتا ہے مگر ملتا ضرور ہے۔ناشکری انسان کو اس اندھے کنویں میں گرا دیتی ہے جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

رنگ ورس کی ہوس اور بس

مسئلہ دسترس اور بس

بے خبر

موسم اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ بہار کے رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے آتی ہوئی تازہ ہوا طبعیت میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ باپ کی بیماری نے اسے نڈھال سا کیا ہوا تھا۔ ساری رات اسے جاگ کر والد کو دیکھنا پڑتا۔ ان کا پیمپر بدلنا پڑتا۔ والد کی پینشن سے گھر کا خرچہ مشکل سے چل رہا تھا۔ خالد کی والدہ چند سال پہلے گزر گئی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے والد اب خالد کی ذمہ داری تھے۔ خالد دراز قد، گندمی رنگت کا مالک عام سا نوجوان تھا۔

خالد نے والد کو دلیہ کھلایا۔ خود انڈا بریڈ کھایا کچن کے برتن دھوئے والد کے لیے یخنی چڑھائی اور گھر کی صفائی کرنے لگا۔ اس کا گھر دو کمروں پر مشتمل بوسیدہ فلیٹ تھا۔ جس کے نل ٹپکتے تھے۔ گٹر خراب تھے۔ رنگ و روغن سے عاری دیواریں اپنی بے بسی پر نوحہ کناں تھی۔ جہاں دو وقت کی روٹی مشکل سے پوری ہو۔ وہاں گھر کی تزئین و آرائش کا ہوش کسے تھا۔ چند دن بعد خالد کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تدفین میں ہمسائے اور چند قریبی رشتہ دار شامل ہوئے۔ خالد کو بھی رو دھو کے صبر آ گیا۔

وہ تیس سالہ بے روزگار نوجوان تھا۔ والد کے ساتھ ساتھ سرکاری پینشن بھی داغ مفارقت دے گئی۔ اب خالد تھا اور اس کی کسمپرسی۔ عرصہ دراز سے اس کے ستارے گردش میں چل رہے تھے۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ پے در پے ناکامی نے گویا پنجے گاڑ لیے تھے اور دن بدن مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ملازمت ملتی نہیں تھی وہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ گرانی کے اس دور میں چند ہزار سے کیا بنتا ہے؟ سوشل میڈیا پر ٹرولنگ کرتے ہوئے اس کی نظر ایک

فیس بک پوسٹ پر پڑی۔ایک ستارہ شناس نے پیدائشی زائچہ بنانے کی آفر لگا رکھی تھی۔

"پیدائشی زائچہ بنوائیں اور مستقبل کا حال ستاروں کی روشنی میں جانیں"۔خالد نے واٹ ایپس نمبر نوٹ کیا اور میسج کیا۔جواباً اسے ایڈریس بھیج دیا گیا۔دوسرے دن وہ متعلقہ پتے پر پہنچا گندا سا پرانا محلّہ تھا۔سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔جگہ جگہ گٹر کا پانی کھڑا تھا۔مطلوبہ مکان پر پہنچ کر خالد نے بیل بجائی۔ایک شکست خوردہ بورڈ مکان کے دروازے کے اوپر روشندان کی جگہ پر استادہ تھا جس کے آدھے حصے میں ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا اشتہار لکھا ہوا تھا اور باقی آدھے حصے میں ستارہ شناسی کا زائچہ بنا ہوا تھا۔

موصوف ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہیں۔خالد کی معلومات میں اضافہ ہوا۔

دروازہ کھلا اور ایک میلا کچیلا بدبودار آدمی برآمد ہوا۔

"اسلام علیکم مجھے انیس اکرام سے ملنا ہے" خالد نے کہا۔

"آجاؤ میں ہی ہوں"

انیس اکرام آسٹرولوجسٹ پلس ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے جواباً کہا۔

کمرہ بھی مکین کے ذوق جمال کا عکاس تھا۔گندا اور بے ترتیب۔دھول سے اٹا ہوا بوسیدہ فرنیچر۔

"یہ تو مجھ سے بھی گیا گزرا ہے" خالد نے دل میں سوچا۔

انیس اکرام نے ایک کاغذ قلم اٹھایا اور خالد کے زائچے کا اسکیچ بنایا اب اس نے خالد کی تاریخ پیدائش وقت پیدائش اور علاقہ پیدائش اور شہر پوچھا۔خالد نے بتائی۔

اس نے زائچے کے بارہ گھروں (خانوں) میں کیتو، راہو وغیرہ کا ندراج کیا۔کمرے میں پھیلی ہوئی عجیب سے بساند خالد کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔مجبوراً وہ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر وہ خالد سے مخاطب ہو کر بولا۔

تمہارے والدین کی وفات ہو چکی ہے۔نوکری تم کو نہیں ملتی کیونکہ تمہارے زائچے کے مطابق

تمہارا طالع پیدائش برج جدی اور حاکم سیارہ زحل ہے۔ زائچہ میں اس وقت مہادشا راہو اور انتر دشا بھی راہو کی چل رہی ہے راہو کا دور بہت خطرناک ہے۔ راہو تمہارے چھٹے گھر میں بیٹھا ہے اور یہاں سے نحوست باقی گھروں پانچویں، ساتویں اور نویں گھر پر ڈال رہا ہے اس کا منحوس سایا تمہارے مستقبل کو نگل رہا ہے دوسرا گھر دھن گھر ہے وہ بالکل خالی پڑا ہے اسے بھرنے کے لیے زور لگانا پڑے گا۔

زحل نحس اکبر ہے یہ یم راج ہے فرشتہ اجل ہے۔

یمراج"۔

ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے انیس اکرام نے مزید کہا۔

"بس بھئی تم بہت خطرے میں ہو موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے انیس اکرام نے خالد کو ڈرایا۔

"پھر میں کیا کروں؟ خالد نے پوچھا

"میرے پاس حل ہے تم مجھے تیس ہزار دے دو میں آنے والے خطرے سے بچنے کا طریقہ بتا دونگا۔"

"میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں"

"ایک تو سب فقیر یہاں چلے آتے ہیں" انیس اکرام بڑبڑایا۔

"امیروں کو کیا پڑی ہے کہ اپنا وقت برباد کریں گے" خالد نے بھی جواب دے دیا۔

خالد کے تیور دیکھ کر انیس اکرام نے تیور بدلے اور خالد کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے ایک اور چال چلی۔

میاں تمہاری شادی کے رستے میں بھی بندش ہے۔ زائچے کا ساتواں گھر نحوست کے اثرات میں گھرا ہوا ہے۔

" ٹھیک ہے میں سوچ کے بتانگا اب میں چلتا ہوں"۔ خالد نے کہا۔

"میری فیس"

خالد نے جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکالا اور انیس اکرام کی ہتھیلی پر رکھا۔

"میرے پاس موکل بھی ہیں میں تمہارے مسئلے حل کر سکتا ہوں سوچنا ضرور"

انیس اکرام نے خالد کے نکلتے نکلتے پیچھے سے صدا لگائی۔

خالد مزید مایوس ہو گیا۔انیس اکرام کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ یہ ہی باتیں سوچتا سوچتا سو گیا۔صبح وہ پژمردہ سا اٹھا۔دل کہتا انیس اکرام کی باتوں پر یقین کر لے۔دماغ کہتا سالا جھوٹا ہے کمینہ دھوکہ دے رہا ہے۔

کیا کروں؟

پہلے تیس ہزار جمع کر لیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں یہ صحیح ہے اس نے خود کو مشورہ دیا۔

☆☆☆☆

انیس اکرام کا شمار ناکام ترین افراد میں ہوتا تھا۔وہ بہت نالائق طالب علم تھا۔میٹرک بمشکل پاس کیا۔پھر ہومیو پیتھک کورس کر لیا۔اس کے بعد ستارہ شناسی کا علم حاصل کر لیا۔ستاروں کی چالیں اسے ازبر تھیں۔ایک لڑکی کو عشق کے جال میں پھنسا کر گھر سے بھگا کر شادی کر لی۔تین بچے تھے۔لگی بندھی آمدنی تو کوئی نہیں تھی بس خالد جیسے کسی پریشان حال کو اپنے جال میں پھنسا کر مال نکلوا لیتا تھا۔جس سے خرچ پورا نہیں ہوتا تھا جس کے لیے اسے قرض لینا پڑتا تھا۔قرض کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔قرض خواہ تنگ کرتے تھے۔انیس اکرام کے پاس ان سے نپٹنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

"لوگوں کے زائچے پڑھتے ہو کبھی اپنا بھی پڑھ لو۔ہمارے حالات کب بہتر ہونگے ہمیں بھی بتا دو" انیس اکرام کی بیوی نے طعنہ دیا۔

"بہت جلد ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے"

"یہ تو میں بارہ سال سے سن رہی ہوں"

"ایسا کرو پکانے کے لیے کچھ لا دو" بیوی نے مطالبہ کیا۔

"آلو پڑے ہیں پکا لو"

"روز روز آلو ہم سے نہیں کھائے جاتے"

" کچھ کرتا ہوں صبر کرو چند دن"

خالد بچارا ایک اور ٹیوشن ڈھونڈ رہا تھا تاکہ انیس اکرام کی مطلوبہ رقم جمع کر سکے۔ چند دن گزر گئے۔

☆☆☆☆☆

انیس اکرام کا دروازہ کوئی زور سے پیٹ رہا تھا دو آدمی تھے۔اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

"اسے کہو ہماری رقم دے دے کل پھر ہم آئیں گے "ایک آدمی نے انیس اکرام کی بیوی سے کہا۔ وہ قرض خواہ موٹر سائیکل پر نکلے اور مین روڈ کا رخ کیا۔

انیس اکرام مین روڈ کے پٹرول پمپ سے موٹر سائیکل میں پٹرول ڈلوا رہا تھا۔قرض خواہوں کی نظر اس پر پڑی ان میں ایک نے اسے آواز دی۔انیس اکرام نے گھبرا کے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور بھاگ نکلا۔ دونوں آدمی اس کا تعاقب کرنے لگے۔ تیز اسپیڈ سے جاتا ہوا انیس اکرام بس کے سامنے آ گیا بس اس کے نچلے دھڑ پر سے گزر گئی۔

خالد اسی سڑک سے گزر رہا تھا کہ بھیڑ دیکھ کر رک گیا جب اس نے آدمیوں کو ہٹا کر آگے جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا انیس اکرام کی ٹانگیں کچلی گئی تھی اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔اس کے پاس دو آدمی

کھڑے تھے جو اسے باتیں سنا رہے تھے۔

"فراڈ یا ہے فراڈ یا ستاروں کا حال بتاتا ہے اپنا حال دیکھو۔" ایک قرض خواہ بولا۔

"اپنا زائچہ بھی بنا لیتے تو حادثے سے بچ جاتے" دوسرے نے لقمہ دیا۔

اتنے میں انیس اکرام نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ کسی نے ایمبولینس کو فون کر دیا اس کی ڈیڈ باڈی ہسپتال پہنچادی گئی۔ خالد انیس اکرام کے گھر پہنچا۔

اس کی بیوی کو اطلاع دی انیس اکرام کی جوان بیوہ اور تین کم سن معصوم بچوں کو دیکھ کر خالد کا دل بھر آیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ ان کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ کاش کہ اس نے حرام ذریعہ معاش نہ چنا ہوتا خالد نے دل میں سوچا اور اپنے حال پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا

اپنی تقدیر سے بے خبر تھا۔

بغض

جون کا مہینہ تھا۔شدید گرمی میں پنکھے کی ٹھنڈی ہوا غنیمت تھی ۔ باہر لو چل رہی تھی ۔ مائرہ بیڈ پر نیم دراز کہانی پڑھنے میں مصروف تھی ۔مطالعے کا شوق اسے بچپن سے تھا۔اطفال ادب سے شروع ہونے والا یہ شوق کالج کے زمانے میں بھی جاری وساری تھا۔گرمی کی دوپہر کا بہترین مصرف اسکے نزدیک کتب بینی تھا۔" میری بیٹی کیا کررہی ہے۔مطالعہ میں مصروف ہے۔شام کو چائے پر کچھ مہمان آئیں گے تیار ہوجانا"۔ مائرہ کی ماما نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔"جی ماما" وہ تابع داری سے بولی۔ مائرہ فرمانبردار اور سلیقہ شعار بچی تھی ۔زمانے کی ہوا اسے نہیں لگی تھی ۔ وہ چالاکی اور ہوشیاری سے بہت دور تھی ۔اس کی ظاہری شخصیت بھی محسور کن تھی ۔گلابی رنگت ، کتابی چہرہ ، دلکش نقوش اور دراز قامت والی مائرہ کا ظاہر اور باطن دونوں ہی اجلے تھے۔شدید گرمی کا موسم تھا جون کا مہینہ تھا۔سورج آگ اگل رہا تھا ۔ مائرہ نہا دھو کر تیار ہوگئی ۔ مہمان مقررہ وقت پر آئے۔لڑکے کی ماں ، خالہ اور پھوپھی رشتہ دیکھنے آئی تھیں ۔تینوں خواتین باتونی اور تیز طرار لگ رہی تھی ۔لڑکے کہ والدہ سعیدہ بیگم اپنے بچوں کے تعریف میں رطب لسان تھی ۔انکے خیال میں ان کی اولاد اور وہ خود دودھ کے دھلے ہیں ۔ یہ ستائش خود پسندی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ۔ مائرہ کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی ۔ وہ لوگ چلے گئے تو مائرہ کے والد اجمل حق مائرہ کی والدہ نسیم بانو سے کہنے لگے " کچھ عجیب سی خواتین تھی خاص طور پر سرمد کی والدہ"۔ "ہمیں ان سے کیا ہمیں تو لڑکے میرا مطلب ہے سرمد سے غرض ہے ۔لڑکا دیکھیں گے اس سے ملیں گے پھر کوئی

فیصلہ کریں گے "۔نسیم بانو نے کہا۔اکثر اسی سوچ کے تحت ہمارے معاشرے کی معصوم بچیوں کو اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔سرمد کے گھر جانے کے بعد اور سرمد سے ملنے کے بعد اجمل حق تو شش و پنج کا شکار تھے لیکن نسیم بانو نے رشتہ کے لیے رضامندی کا اظہار کیا۔دونوں طرف سے معاملات طے کیے گئے اور شادی کا دن مقرر کر دیا گیا۔مائرہ اور سرمد کا فون پر رابطہ ہو گیا اور دونوں بات چیت کرنے لگے۔سعیدہ بیگم کو بھی خبر ہو گئی وہ بہت تلملائی۔"چھوٹی عمر کی لڑکی منتخب کی تھی کہ کم عقل ہو گی میرے اشاروں پر چلے گی لیکن یہ تو بڑے بڑوں کو مات دے رہی ہے۔شادی شدہ بیٹی سے سعیدہ بیگم نے کہا۔ بری کے نام پر سعیدہ بیگم نے اپنی شادی شدہ بیٹی جو کہ بیرون ملک مقیم تھی کے جہیز کے استعمال شدہ کپڑے منگوا کر لگا دیے۔اور جہیز منہ سے مانگ کر لیا۔اس کے باوجود سعیدہ بیگم خوش نہ تھی۔وہ مائرہ کو ہر وقت جہیز کے طعنے دیتی رہتی۔ایک دن کہنے لگی" تمہاری ماں نے بالٹی اور مگ تو دیا نہیں۔اسے پتا نہیں تھا شادی کے بعد تمہیں نہانا بھی ہو گا"۔بھولی بھالی مائرہ کو ایسی باتوں کا جواب دینا نہیں آتا تھا۔حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتی رہتی۔سعیدہ بیگم کے اوچھے وار دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔وہ مائرہ کو عجیب عجیب طریقوں سے تنگ کرتی رہتی۔اس کے دل میں مائرہ کے لیے شدید نفرت، بغض، کینہ اور حسد تھا سعیدہ بیگم یہ بات نہیں جانتی تھی کہ جھوٹ کے پاں نہیں ہوتے۔مگر غیبت اور بہتان کے پاں ہوتے ہیں یہ گھوم پھر کر ایک دن اس انسان تک پہنچ جاتی ہیں۔جس کی غیبت کی گئی ہو۔جس پر بہتان باندھا گیا ہو۔ہزار گز کے پرانے بنے ہوئے بنگلے میں رہنے والی بھاری جسم اور چھوٹے قد کی بدصورت عورت سعیدہ بیگم کے چہرے پر چھائی کرختگی نے اس کے نقوش کو مزید بدصورت بنا رکھا تھا۔اندر کی سیاہی اس عورت کے چہرے سے چھلکتی تھی۔سردیوں کے یخ بستہ ایام چل رہے تھے۔لحاف سے باہر نکلنے کو جی نہیں کرتا تھا۔گلابی جاڑے کی سردی میں سعیدہ بیگم بمشکل بیڈ سے اٹھی اور دیوار کے سہارے چلتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گئی۔اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کی پرچی دبی ہوئی تھی۔اس

نے بیڈ شیٹ اٹھائی اور میٹرس کی زپ کھول کر وہ تعویز اس میں رکھ کر زپ بند کی۔ بیڈ شیٹ ٹھیک کی پھر کمرے میں واپس آ کر وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ ملکیت کا زعم اس عورت کے تکبر کا سبب تھا۔ یہ بنگلہ اس کے مرحوم شوہر کا تھا۔ شرعی اور قانونی طور پر بیوہ ایک بٹا آٹھ حصے کی مالک ہوتی ہے۔ مگر فطرتاً قابض طبعیت کے باعث وہ ہر شے پر تسلط چاہتی تھی۔ وہ شے بنگلہ ہو یا انسان اس عورت کے لیے ایک برابر تھے۔ اور تسبیح کرنے لگی۔ تسبیح کے بعد اس کی پھونکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ گاڑی اندر داخل ہوئی۔ ایک جوان جوڑا گاڑی سے اتر کے اندر داخل ہوا۔ یہ سعیدہ بیگم کے بیٹا بہو مائرہ اور سرمد آئے تھے۔ بیٹا پینتیس سالہ فربہی مائل جسم کا مالک تھا اور بہو بیس سالہ نازک سی لڑکی تھی۔ دونوں نے سعیدہ بیگم کو سلام کیا۔ سعیدہ بیگم نے گھٹنے پکڑ رکھے تھے۔ "ہائے یہ درد تو میری جان لے لے گا وہ گویا ہوئی۔ بہو بچاری ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر ساس کے ٹانگیں دبانے لگی۔ سعیدہ بیگم اپنی مکاری بہو کی کم عمری اور کم عقلی پر مسکرانے لگی۔ مائرہ کافی دیر تک دباتی رہی۔ پھر ساس سے اجازت لے کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا شوہر سرمد سو چکا تھا۔ وہ بھی نماز پڑھ کر بستر میں دراز ہو گئی۔ آدھی رات تک سعیدہ بیگم کیبل پر فلمیں دیکھتی رہی پھر اٹھی اور بیٹے بہو کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سن گن لینے لگی۔ یہ سرگرمی ان کی پسندیدہ تھی۔ اندر خاموشی تھی" منحوس وہ زیر لب بڑبڑائی اور اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ کل کا پروگرام بنانے لگی۔ اس کا سازشی ذہن کہانیاں بننے لگا۔ صبح مائرہ نے ناشتہ سرمد اور ساس کو دیا۔ ساس نے جمعہ کے دن نہانے کا ارادہ ظاہر کیا اور بہو کو پانی گرم رکھنے کا کہا۔ خود وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ مائرہ نے ساس کے کپڑے استری کیے۔ گرم پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے یکے بعد دیگرے باتھ روم میں پہنچائی اور کھانا بنانے لگی۔ سعیدہ بیگم نے ہفتے بھر کی میل مل مل کے اتاری۔ نہا کر عبادت کا شور مچایا اور نماز پڑھنے لگ گئی۔ نماز کے بعد سعیدہ بیگم نے کھانا کھایا۔ کھانے میں نقص نکالے۔ بہو کو پھوہڑ قرار دیا اپنے سگھڑاپے کے جھوٹے قصے سنا کر محلے کے دورے پر

نکل گئی۔ مائرہ بچاری خاموشی سے سعیدہ بیگم کے طعنے سنتی رہی۔سعیدہ بیگم نے تین ہمسائیوں کے گھر باری باری چکر لگایا۔ان کے گھٹنے کا درد بھی غائب ہو چکا تھا۔ بہو سے نفرت ان کے رگ و پے میں طاقت بھر دیتی تھی۔سعیدہ بیگم نے اپنی بہو سے متعلق جھوٹی کہانیاں سنائی۔اپنے بڑھاپے اور بیماریوں کا رونا رویا۔اور گھر واپس آ گئی۔دو سے چھ بجے تک سعیدہ بیگم نے غیبت،چغلی،جھوٹ،مبالغہ آرائی، بہتان کے ذریعے خوب گناہ کمایا۔جمعہ کے دن کی یہ کمائی ان کی روٹین کا حصہ تھی۔گھر واپس آ کر حسب عادت انہوں نے بہو کو منافقت سے بے وقوف بنایا اور اپنے کام کروائے۔اس منحوس کو تو میں گھر سے نکال کر رہونگی۔دل میں ارادہ کیا۔سعیدہ بیگم ان ساسوں میں سے تھی جنہیں بہو سے بلاوجہ کی پرخاش ہوتی ہے۔وہ اپنے بیٹے کی محبت اور پیسے کا بٹوارہ برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔وہ بہو کو ہر صورت طلاق دلوانا چاہتی تھی۔تین ماہ گزر گئے۔سعیدہ بیگم مایوسی کا شکار ہو کر ایک نجومی کے پاس چلی گئی۔بہو کام والی سے کام کروارہی تھی۔"باجی ایک بات کہوں" ہاں ثمینہ کہو باجی میرا نام نہ آئے ورنہ بڑی باجی مجھے کام سے نکال دیں گی۔یہ جو آپ کی ساس ہیں نا آپ کے بارے میں بہت جھوٹی باتیں کرتی ہیں۔انہوں نے سامنے والی فہد کی ماما سے کہا ہے" کہ آپ اپنے شوہر کو مارتی ہے۔اور ساس کو گالیاں دیتی ہے۔اور جادو بھی کرتی ہے۔آپ کے گھر والوں کا تعلق گھٹیا خاندان سے ہے۔آپ اپنی امی کو پیسے بھی دیتی ہے بہو بچاری حیرت سے مرنے والی ہوگئی۔" لیکن میں تو ایسی نہیں ہوں تم جانتی ہو" جی باجی میں نے بھی کہا تھا۔باجی تو بہت اچھی ہے۔آپ دھان پان سی ہیں۔بھائی جان تو بھاری جسم کے ہیں۔اپنی ماں کی طرح۔وہ کیسے آپ سے مار کھا سکتے ہیں ملازمہ بولی۔ملازمہ کام ختم کر کے چلی گئی۔فروا بچاری بیٹھ کر رونے لگی۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔تھوڑی دیر بعد اس کا شوہر اور ساس واپس آ گئے۔اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سرمد نے پوچھا تو وہ بولی" میرے پیٹ میں درد ہے ساس چونکی کہیں اس پچھل پیری کو حمل تو نہیں ہوگیا۔ساس نے دل میں سوچا۔پھر ساس کو نجومی کی باتیں یاد آنے

لگی۔"تری بہو ساڑھ ستی ہے۔۔تری بہو کے زائچے میں سات سال نحوست کے ہیں۔جان چھڑا لے اس سے۔سعیدہ بیگم نے باتوں باتوں میں بہو سے معلومات لے لی تھیں اور بہو کا زائچہ بنوایا تھا ۔" کیسے اس منحوس سے جان چھڑواں۔کیا کروں بستر پر لیٹ کر سعیدہ بیگم نے اپنا محبوب مشغلہ اپنایا۔ انڈین فلم دیکھنے لگی۔ان کے خیالات بار بار بھٹک رہے تھے۔سمجھ نہیں آ رہا تھا۔بہو کا کیا کرے۔فلم نے سعیدہ بیگم کی مشکل آسان کر دی۔صبح سعیدہ بیگم نے ملازمہ سے پیٹی کھلوائی اور لحاف چھت پر ڈالنے کا کہا۔ملازمہ لحاف ڈال کے چلی گئی۔بہو سعیدہ بیگم کے کام تو کر رہی تھی۔لیکن وہ پہلے والا جوش وخروش ناپید تھا۔اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔مغرب کی اذان ہوئی تو سعیدہ بیگم چھت پر چڑھ گئی اور بہو کو آوازیں دینے لگی۔بہو نے سنی ان سنی کر دی۔سعیدہ بیگم کہاں باز آنے والی تھی۔چار و ناچار بہو کو چھت پر جانا پڑا ۔سعیدہ بیگم نے مائرہ کو تین رضائیاں اٹھوائی اور نیچے جانے کا کہا۔جونہی مائرہ نے اوپر والی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا سعیدہ بیگم نے بہو کو دھکا دے دیا۔مائرہ نیچے گری اور گرتے ہی مر گئی۔اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔بیس سالہ مائرہ ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح پڑی ہوئی تھی۔جس کی گردن ظالم جادوگرنی نے مڑوڑ دی تھی۔اتنے میں لوگ جمع ہونے لگے۔مائرہ کا شوہر سرمد بھی دفتر سے معمول کے مطابق پہنچ گیا ۔گھر کے باہر مجمع دیکھ کر وہ چونکا۔جب اس کی نظر مائرہ پر پڑی تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔سعیدہ بیگم بھی واویلا مچاتے ہوئی پہنچی اور دہائیاں دینے لگی۔"ہائے میری بہو۔ہائے میری پری۔کس کی نظر لگ گئی۔کیسے گر گئی۔کوئی تو بتائے مجھے کیا ہوا ہائے ہائے۔وہ سینہ کوبی کرنے لگی۔اتنے میں ایک دس سالہ بچہ آگے بڑھا اور بولا"ان آنٹی نے ان کو مارا ہے یہ دیکھیں میں اپنی چھت پر پتنگ کی ویڈیو بنا رہا تھا تو اس میں یہ بھی ریکارڈ ہو گیا اس نے موبائل سرمد کو دیا۔سعیدہ بیگم مائرہ کو دھکا دے رہی تھی۔"امی آپ آپ بیٹا بچارہ اونچی اونچی رونے لگا اتنے میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ویڈیو وہاں پر کھڑے سب افراد نے باری باری دیکھی۔انسپکٹر نے بھی دیکھی اور سعیدہ بیگم کو گرفتار کر لیا۔سرمد کی بیوی مر گئی۔ماں جیل چلی گئی

۔بچارہ گھر میں اکیلا رہ گیا۔وہ تنہائی،غم اور ماں کے اس فعل سے ذہنی مریض بن گیا۔اس کی ملازمت جاتی رہی وہ بچارہ در در کی ٹھوکریں کھانے لگا اور بددل ہوکر شہر ہی چھوڑ گیا۔اس کے ایک دوست کا پہاڑی پر فضا مقام پر ہوٹل تھا وہ اس دوست کے پاس چلا گیا اور زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔سعیدہ بیگم کو سات سال قید سنائی گئی۔سات سال بعد سعیدہ بیگم جیل سے چھوٹی تو کوئی ٹھکانہ نہ ہونے کے باعث ایدھی سنٹر چلی گئی۔اس کے خالی مکان پر ایک اوباش نے قبضہ کرلیا تھا۔بے گھر عورتوں کے ساتھ رہتے رہتے ایک دن وہ مرگئی اور لاوارث قرار دے کے دفنا دی گئی۔سعیدہ بیگم کے بغض نے اس کا گھر اجاڑ دیا۔

ایک بدفطرت عورت کے ہاتھوں مائرہ بچاری تو مفت میں ماری گئی تھی۔۔

وسواس الخناس

حسب معمول اس کی آنکھ شام کے پانچ بجے کے قریب کھلی۔ بستر سے اٹھنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔فروری کا مہینہ تھا۔گرم بستر کی خوش کن حدت کو چھوڑنا آسان نہ تھا کسلمندی سے اٹھتے ہوئے اس نے کچن کا رخ کیا۔ایک کپ چائے بنائی اور پینے لگی۔اتنی دیر میں فون کی بیل بجی۔اس نے اپنی ماں کا نمبر دیکھ کر کال ریسو کی۔"اسلام علیکم امی کیسی ہیں آپ"؟"وعلیکم اسلام۔میں ٹھیک ہوں۔تم کیا کررہی ہو ثنا" چائے پی رہی ہوں" کتنی دفعہ سمجھایا ہے خالی پیٹ چائے مت پیا کرو"۔ماں نے گھر کا۔"امی سستی ہورہی تھی ناں اس لئے۔" ثنا نے جواب دیا۔"تو بیٹا صبح اٹھا کرو۔فجر کی نماز پڑھا کرو۔تلاوت قرآن پاک کیا کرو۔اللہ سے دعا مانگا کرو اس کا شکر ادا کیا کرو"۔ماں نے مشورہ دیا۔"امی مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔سب کچھ تو ہے میرے پاس پھر شکر کس بات کا ثنا نے لا پروائی سے بات ٹالی۔"ایسے نہیں کہتے۔ناشکری نہیں کرتے۔ثنا بہت خوبصورت تھی۔دراز قد،سفید گلابی رنگت،متناسب سراپا،لمبے گھنے بال۔بہت مہنگی یونی ورسٹی سے اس نے فزکس میں بی۔ایس کیا تھا۔ثنا کے والدین کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ماں نے سمجھایا پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ثنا نے کھانا تیار کیا۔شام کے سات بجے اس کا خوبرو،اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر جو کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔گھر واپس آیا۔محسن نے کپڑے تبدیل کیے اور وہ دونوں کھانا کھانے لگے۔کھانے کے بعد ثنا نے کروم کاسٹ پر ایک نیٹ فلیکس کی نئی ریلیز شدہ فلم لگالی۔اور وہ دونوں فلم دیکھنے لگے۔فلم

کے بعد دیر تک باتیں کرنے کے بعد وہ دونوں رات کے دو بجے سو گئے۔ دونوں کی شادی کو تین ماہ کا عرصہ گزر رہا تھا۔نئی شادی کے ابتدائی ایام تو گھومنے پھرنے میں گزر گئے۔ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کا یہ عرصہ خوشگوار یادیں چھوڑ گیا تھا۔روزمرہ کی روٹین شروع ہونے کے باوجود ثنا کے لیے ہر رات شب برات تھی اور ہر دن عید کے دن جیسا مسرت بھرا تھا۔محسن کی قربت نے اس کی زندگی میں جو رنگ بھرے تھے وہ شوخ اور دیرپا تھے وہ بہت خوش تھی۔اسے خود سے زیادہ کامیاب اور خوش قسمت روئے زمین پر اور کوئی دوسری عورت نظر نہیں آتی تھی۔خود پسندی اور تکبر نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ ثنا کے گھر میں اللہ کا ذکر کرنے والی زبان،قرآن کھولنے والے ہاتھ، نبی پر درود پڑھنے والے مسلمان کی کمی ایسی کمی تھی جو کہ اس کے گھر کے سکون کو نگلنے والی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں سے ایک بھی نمازی ہوتا تو وسواس الخناس اس کے گھر کا رخ نہ کرتے۔دنیا میں مگن دنیاداری میں ڈوبے غافل انسان جنات اور شیاطین کا آسان ٹارگٹ ہوتے ہیں۔تین بجے ثنا کی آنکھ اچانک کھل گئی۔عجیب سی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کسی جانور کی غراہٹ ہو۔اچانک ثنا کو محسوس ہوا اس کے بستر پر کوئی ہے وہ خوف زدہ ہوگئی۔ بولنا چاہا تو آواز نہیں نکلی۔کابوس کی کیفیت اس کے وجود پر طاری ہوگئی۔ کمرے میں موجود وجود آہستہ آہستہ ثنا کی طرف بڑھ رہا تھا۔اس کے اوپر موجود بیڈ سپریڈ پر چل رہا تھا۔اچانک محسن کی کھانسی نے ہوا میں ارتعاش پیدا کیا اور وہ وجود غائب ہوگیا۔کمرے کی بوجھل فضا یکدم تبدیل ہوگئی۔ثنا نے لمبا سانس لیا اور محسن سے لپٹ گئی۔محسن کی آنکھ کھل گئی" کیا ہوا" محسن نے پوچھا" کچھ نہیں ثنا بولی۔اس نے محسن کے سینے میں سر چھپا لیا۔محسن نے اسے باہوں میں بھر لیا اور وہ دونوں سو گئے۔صبح محسن حسب معمول بغیر ناشتہ کیے دفتر چلا گیا۔ثنا شام تک سوتی رہی۔جب ثنا چار بجے اٹھی تو اس نے بیڈ پر بیٹھ کے انگڑائی لی تھی کہ اسکی نظر کمرے کے کونے میں موجود کالے رنگ کی بلی پر پڑی۔ بلی کی خوفناک سبز آنکھیں دیکھ کر اسے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ بلی مسلسل ثنا کو گھور رہی تھی۔ثنا کے تو بدن کا لہو خشک ہوگیا۔کیا کرے کیا

نہ کرے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر نظر جھکا لی۔ دوبارہ نظر اٹھائی تو کمرے کا وہ حصہ خالی ہو چکا تھا۔ اور بلی غائب ہو چکی تھی۔ ڈرتے ڈرتے ثنا نے بستر کے نیچے جھانکا ادھر ادھر دیکھا جب اسے یقین ہو گیا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو وہ بستر سے نیچے اتری اور یہاں وہاں دیکھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ اس نے سوچا۔ فون پر ماں سے بات کرتی ہوں۔ اس نے ماں کا نمبر ملایا اور بات کرنے لگی۔ حال احوال کے بعد رات کی کاروائی اور کالی بلی کا قصہ سنانے کا آغاز ہی کرنے والی تھی کہ اس کی نظر دیوار پر پڑی۔ وہ کالی بلی دیوار پر بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ ثنا کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ وہ کچن سے اندر لاونج میں بھاگی۔ صوفے پر بیٹھ کر محسن کو کال کرنے لگی۔ محسن نے فون نہیں اٹھایا۔ اس نے وائس میسج چھوڑ دیا" محسن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے جلدی آ جائیں "۔ آدھے گھنٹے بعد محسن گھر پہنچا محسن کو دیکھتے ہی ثنا اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ اور بلی کا واقعہ کہہ سنایا۔ محسن نے اسے تسلی دی۔ اور کپڑے بدلنے کا کہا۔ ثنا نے الماری کھولی اور ایک سوٹ اٹھایا۔ جب سوٹ استری کے لیے کھولا تو سارا سوٹ جگہ جگہ سے کٹا ہوا تھا۔ ثنا کا واویلا سن کر محسن آیا اور سوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا" چلو کوئی بات نہیں تم دوسرا پہن لو" یہ میرا نیا سوٹ ہے بہت شوق سے لیا تھا" ثنا گلوگیر آواز سے بولی۔ میں تمہیں ایسا اور لے دونگا۔ گھر کے ماحول سے وقتی فرار کے لیے وہ دونوں ہوٹل گئے اور کھانا کھا کر آ گئے۔ رات پھر وہی کل والا واقعہ پیش آیا اس دفعہ چلنے والے کا وجود نظر آ گیا وہی کالی بلی ثنا پر حملہ کے لیے پوزیشن لے رہی تھی کہ ثنا کی چیخ نکل گئی محسن اٹھ گیا بلی غائب ہو گئی۔ ثنا زور زور سے رونے لگی۔ محسن نے اسے تسلی دی اور اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ دوسرا دن خیریت سے گزر گیا۔ رات کو ثنا سونے کے لیے لیٹی تو اس کا بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ عجیب سی طبعیت ہو رہی تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک شور سے آنکھ کھلی۔ کمرہ غراہٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا بہت سارے جانور کمرے میں موجود ہیں ان جانوروں کی بدبو سے ثنا کا دماغ پھٹنے لگا اچانک کالی بلی نے ثنا پر چھلانگ لگائی اور اس کی گردن دبوچ لی۔ نوکیلے

دانت ثنا کے نرخرے میں اتر گئے۔ثنا کی چیخیں سن کر محسن اٹھا۔تکیہ خون سے بھر چکا تھا اور ثنا درد سے تڑپ رہی تھی۔محسن نے دوپٹہ ثنا کی گردن پر باندھا۔ثنا کو بازوں پر اٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا۔ایمرجنسی میں ثنا کی مرہم پٹی کی گئی اور خون لگایا گیا۔محسن کے استفسار پر ڈاکٹر نے بتایا کسی جانور نے ثنا کو نوکیلے دانتوں سے زخمی کیا ہے۔ثنا چار دن اسپتال رہ کر اپنی والدہ کی گھر چلی گئی۔اپنے اور محسن گھر آنے سے اس نے انکار کر دیا۔اس کی حالت دیکھ کر محسن نے بھی اصرار نہیں کیا۔ثنا کی والدہ ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھ کر ثنا پر دم کرتی۔ثنا کی حالت دن بدن بہتر ہو رہی تھی۔والدہ کو ثنا نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ثنا کی بات سن کر ثنا کی والدہ نے ایک اللہ والے بزرگ سے رابطہ کیا۔بزرگ نے ثنا سے ملاقات کی۔اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔بزرگ نے ثنا کی والدہ کو بتایا کہ شیطانی جنات بلی، کتے اور سانپ کی شکل اختیار کر کے انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ثنا کو بھی ایک مارج نامی شیطانی جن مارنا چاہتا ہے۔کالے جادو کے عمل سے اس جن کو ثنا کے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔" کس نے کالا جادو کروایا ہے میری بچی پر ثنا کی والدہ نے پوچھا؟"اس بات کو جانے دیں۔نمازی پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔نماز کی پابندی، شام وسحر کے اذکار اور دعائیں ایسی آزمائشوں سے مسلمانوں کو بچاتے ہیں۔"بزرگ نے متانت سے سمجھایا۔ثنا کے لیے انہوں نے تعویز بنایا جو کہ اسے گلے میں پہنا دیا گیا۔اس کے ساتھ انہوں نے ثنا کو سورہ رحمٰن پڑھنے کی ہدایت بھی کی۔سورہ یسین کی آیت نمبر نو پڑھ کر دم کرنے کی ہدایت کی۔"اسے دوبارہ اس گھر میں مت جانے دیں۔مکان بدل لیں۔یہ کہہ کر وہ بزرگ چلے گئے۔ثنا کے شوہر نے گھر بدل لیا۔یہ گھر جو پوش علاقے میں واقع تھا لگژری اپارٹمنٹ تھا۔مسجد قریب تھی۔اذان کی آواز پانچ وقت سنائی دیتی۔ثنا اور محسن پابندی سے نماز پڑھنے لگے۔ثنا بھی آہستہ آہستہ نارمل ہوتی چلی گئی۔برے جنات نما شیاطین سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔

پریشر ککر

پریشر ککر کی سیٹی کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ جونہی سیٹی چلنے کا آغاز ہوا۔فریدہ بیگم نے وقت نوٹ کرلیا۔ پندرہ منٹ گزر گئے تو فریدہ بیگم کی پاٹ دار آواز گھر میں گونجنے لگی۔ "نعیم نعیم جا کر ککر والا چولہا بند کردے تری بیوی کے کانوں میں تو لگتا ہے روئی ڈھونسی ہوئی ہے"۔ ماں کی پکار سن کر نعیم نے چولہا بند کر دیا۔ چند منٹ بعد ککر کی آواز کم ہوتی ہوئی بند ہوگئی۔فریدہ بیگم نعیم کو اپنے پاس بٹھا کر بہو کی کاہلی، لاپروائی اور پھوہڑ پن پر لیکچر دینے لگی۔ "بس سب کچھ اکھٹا کر کے ککر میں ڈال دیتی ہے اور سالن کے نام پر ملغوبہ پکا کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔فریدہ بیگم نے بہو کی کارگزاری پر روشنی ڈالی۔ نعیم میاں ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ سعدیہ ساری گفتگو اپنے گناہ گار کانوں سے سن رہی تھی اور اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ پریشر سے اس کا دماغ بھر رہا تھا لیکن وہ سیٹی نہیں بجا سکتی تھی۔ بھاپ نکلنے کا راستہ بند تھا۔اسے غصہ دل میں دبائے رکھنا تھا۔ ماں بیٹے سے مقابلے کا تو کچھ فائدہ نہیں تھا وہ صبر ہی کرسکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شوہر کی کمرے میں آمد ہوگئی اور وہ اپنی ماں کی زبان بولنے لگا۔ سعدیہ نے بھی ممکنہ جوابات سوچ رکھے تھے۔ "دیکھیے نعیم صاحب میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں ان کو سارا دن سنبھالنا اور گھر کا کام کرنا مجھ اکیلی جان کے ذمے ہیں۔ کپڑے برتن دھوتے دھوتے سارا دن نکل جاتا ہے۔ابھی بھی میں سرمد کو نہلا رہی تھی۔ پریشر ککر سے وقت کی بچت ہو جاتی ہے اس لیے اس میں سالن نما ملغوبہ بنا لیتی ہوں"۔ سعدیہ کی بات میں وزن تھا۔نعیم چپ کر گیا۔فریدہ بیگم کا محبوب مشغلہ غیبت

تھی۔وہ فون پر بیٹیوں ، بہوں ، رشتہ داروں سے سعدیہ کی برائیاں کرتی رہتی۔کوئی ہمسائی آتی تو اس کے کان بھرتی رہتی۔اپنا پریشر وہ دوسروں تک منتقل کرنے میں ماہر تھی۔سعدیہ ان کی باتیں سنتی رہتی اور خاموش رہتی۔اللہ سے دعا کرتی کہ اس کے اچھے دن آ جائیں۔فریدہ بیگم کو سعدیہ سے ذاتی پرخاش تھی۔وہ سرے سے نعیم کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔قسمت نے سعدیہ کو انکی بہو بنا دیا۔وہ سعدیہ سے متعلق جھوٹی کہانیاں بنا کر جاننے والوں کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا کرتی رہتی تھی۔وہ بات بات پر سعدیہ کو اور اس کے والدین کو مغلظات سے نوازتی رہتی۔کبھی کبھی سعدیہ کو لگتا اس کی زندگی بھی پریشر ککر کے اندر بند ہے۔جس کے نیچے اس کی ساس کی جلائی ہوئی آگ بھڑک رہی ہے۔وہ اس ککر کے اندر گھوم رہی ہے۔ککر کا پریشر اس کے دماغ اور اعصاب کو شل کر رہا ہے۔ککر کی بھاپ اس کو ادھر ادھر پٹخ رہی ہے۔کوئی اس ککر سے اسے باہر نہیں نکالتا۔کوئی بھی نہیں۔نہ خدا نہ اس کے بندے۔اس ککر کی سیٹی کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی۔شاید عمر بھر اسے اس ککر میں ہی گھومتے رہنا ہے۔نعیم نے اسے آواز دی تو وہ سوچ سے باہر آئی اور روٹی پکانے چل دی۔کھانا ٹرے میں سجا کر شوہر کے سامنے رکھا۔ٹی وی پر خبرنامہ چل رہا تھا۔وہی ملکی مسائل ،مہنگی ناپید بجلی ،گیس کی کمی ،سیلاب کی تباہی ،مہنگائی ،عورتوں اور بچیوں کا ریپ ،معاشی بدحالی وغیرہ سارا سال یہ ہی سنتے رہتے ہیں۔سعدیہ نے سوچا ہمارا ملک بھی شاید پریشر ککر میں بند ہے۔جس کے نیچے آگ جلانے والی استعماری طاقتیں اس ککر میں گھومتے عوام کو کبھی پریشر سے باہر نہیں آنے دیں گی۔آگ جلتی رہے گی ککر کا ویٹ گھومتا رہے گا۔عام انسان پستا رہے گا۔غربت اور مہنگائی کا مسالہ عام انسان کو گلا دے گا۔ملکی ککر کی سیٹی کی آواز سب کو سنائی دیتی ہے لیکن کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں ہے۔

برینڈ بھیڑ چال

زندگی بہت مختصر ہے اور اس زندگی میں وہ لوگ خوش قسمت ترین ہوتے ہیں جنہیں مخلص، ہمدرد اور نیک انسانوں کا ساتھ مل جائے لیکن سب خوش قسمت ہوا ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ اس فانی دنیا میں کچھ کو خوش قسمت اور کچھ کو بدقسمت ہونا پڑتا ہے۔ اسکی ٹانگیں کام کرتے کرتے شل ہوچکی تھی۔ اس نے افطاری کے لوازمات ڈائننگ ٹیبل پر لگائے اور وضو کے لیے واش روم کا رخ کیا۔ اسکی ساس نند اور شوہر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ بڑے دو بچے بھی بیٹھ گئے وہ ان بچوں کو پلیٹیں تیار کر کے دینے لگی۔ اذان ہوگئی تو سب روزہ کھولنے لگے۔ ساس کو پکوڑے ناپسند ہوگئے۔ شوہر کو دہی بڑے میں موجود بڑے سخت لگے۔ اور نند کو سالن بد ذائقہ لگا وہ خاموشی سے سب کے تبصرے سنتی رہی۔ برتن اٹھا کر سنک میں رکھے اور دھونے لگی ساتھ ہی چائے بھی رکھ دی۔ چائے سب کو دے کر وہ نماز پڑھنے لگی۔ پھر بچوں کو ہوم ورک کروایا۔ عشا کی نماز کے بعد جو لیٹی تو ہوش نہ رہا۔ اسکا نواں مہینا چل رہا تھا۔ یہ تیسرا بچہ ہے جو اس کے پیٹ میں ہے۔ رمضان کا بابرکت مہینہ اپنے جلو میں رحمت، مغفرت اور برکتیں سمیٹ کر لا یا تھا، اوائل بہار کے دن تھے۔ موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ پیاس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ روزے داروں کے روزے بہت اچھے گزر رہے تھے۔ محنت کرنے والے یقیناً رب سے صلہ پائیں گے۔ رات میں کچھ خنکی ہوجاتی تھی۔ لحاف ابھی استعمال میں تھے۔ لیکن فروا کا معاملہ اس دفعہ جدا تھا۔ رمضان کی اضافی مصروفیات میں وہ تنہا کام کرنے والی تھی۔ سحری اور افطاری کے ساتھ

سب کھانا بھی کھاتے تھے۔ روزانہ تازہ سالن بنتا تھا۔ بچوں کی وجہ سے فروا کی نیند پوری نہ ہوتی۔ صبح بچوں کو اسکول بھیجتی تو پھر گھر کے کام سے لگ جاتی اس کے باوجود ساس کے ماتھے کے بل نہ جاتے۔ ساس کا رمضان تو بہترین گزر رہا تھا۔ پکا پکایا کھانا مل جاتا۔ سارا دن فون پر بیاہی بیٹیوں اور دیگر بہوں سے غیبتیں چلتی۔ کوئی ہمسائی یا رشتہ دار خاتون آ جاتی تو وہ بھی اس کار خیر میں شامل ہو جاتی۔ ہر وقت بہو کو برا کہنے سے ساس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی اس کی بہو میں سرے سے کوئی خوبی نہیں ہے۔ دنیا کی بری ترین عورت اس کی بہو ہے۔ بدگمانی رشتوں کو دھندلا دیتی ہے۔ محبت، مروت اور احساس کہیں اڑنچھو ہو جاتے ہیں۔ نفرت کا جذبہ ہر احساس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ فروا کی ساس ایسے کیڑے بہو میں ڈالتی کہ سننے والیاں کانوں کو ہاتھ لگا لیتی۔ " گھٹیا خاندان سے ہے۔ سارا دن پلنگ توڑتی ہے کام تو ہم کرتے ہیں ساس اپنی بہن سے گویا ہوئی۔ وہ خاموشی سے سب سنتی اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتی۔ شوہر مٹی کا مادھو تھا یا ماں کی کاربن کاپی تھا اتنے سالوں میں وہ فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ نند روزے نہیں رکھتی تھی اسے گھر کے کسی کام سے سروکار نہ تھا۔ اس کا ایک منگیتر نما عاشق تھا جس سے وہ سارا دن فون پر باتیں کرنے میں لگی رہتی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہیں دور بھاگ جائے لیکن بچوں کے ساتھ کہاں جاتی۔ " میں تو بہت نیک ہوں کسی کو کچھ نہیں کہتی۔ دیکھ لو سارا گھر بہو کے حوالے کر دیا ہے اور خود کونے میں لگی بیٹھی ہوں۔ بہو کے بچہ ہونے والا ہے میں تو اسے کہتی ہوں جیسی تم ویسی میں۔ جو کام تمہارے ہاتھ آئے تم کر لو جو میرے ہاتھ آئے میں کر لوں گی۔ ساس کا خود پرستی نامہ جاری تھا۔ ہمسائی کے جاتے ہی ساس کچن میں آئی۔ بہو کو کاموں کی لسٹ بتا کر کمرے میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ ساری رات جاگ کر ٹی وی دیکھنا فروا کی ساس کا محبوب مشغلہ تھا۔ " ہم نے بھی بچے پیدا کیے ہیں ایک دو تین نہیں سات لیکن کبھی روزے نہیں چھوڑے یہ ماں کے روزہ چھوڑنے سے بچے پر بوجھ پڑتا ہے۔ جہنمی عورت ہے میری بہو۔ آخری مہینہ ہے پھر بھی روزہ نہیں رکھتی"۔ ساس فون پر شادی شدہ بیٹی کے ساتھ بہو کی غیبت

میں مشغول تھی "سعدیہ روزے رکھتی ہے اماں شازیہ نے پوچھا جو جس سے دلشاد بیگم کی گفتگو جاری تھی ۔" نہیں بچاری کمزور ہے ۔میں نے خود کہا ہے رہنے دو روزے ۔ پڑھائی بھی تو مشکل ہے اس کی ۔"ہاں اماں یہ اچھا کیا آپ نے ۔اور آج کیا بنا رہی ہیں شازیہ نے پوچھا" بنانا کیا ہے بہو جو کھلائے گی ۔کھا لیں گے ۔ہم تو کسی کو کچھ کہتے نہیں ہیں ۔حاجی نمازی ہیں ۔میری منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے ۔تمہیں پتا ہے اپنی ماں کا دلشاد بیگم نے جواب دیا" اچھا اماں میری بات غور سے سنیں ۔اس دفعہ عید کرنے میری جیٹھانی لندن سے آ رہی ہے تو میری عیدی اچھی سی ہونی چاہیے ۔تا کہ میری شو بن جائے سسرال میں ۔جس برینڈ کے کپڑے آپ کی بہو کے مائیکے سے آتے اسی برینڈ کے مجھے بھی چاہیے ۔" ارے وہ بی والا برینڈ تو بہت مہنگا ہے ۔دو جوڑے لے کر میرا تو تیس ہزار لگ جائے گا ۔دو جوڑے تیرے بیٹے اور شوہر کے بھی لینے ہونگے ۔ساتھ مٹھائی ،سویاں وغیرہ ۔دلشاد بیگم نے رونا رویا" مجھے نہیں پتا جو مرضی کریں" ۔شازیہ نے فون بند کر دیا ۔کسی طریقے سے بہو کے جوڑے پار کر کے بیٹی کو دے دوں ایک تو یہ برینڈ اور انکی بھیڑ چال ۔نیا عذاب ۔دلشاد بیگم دل ہی دل میں سوچ رہی تھی ۔ دو روزے مزید گزر گئیآ خری عشرہ شروع ہوا تو دلشاد بیگم نے نیا شوشہ چھوڑ دیا اعتکاف کرنا تھا ۔کیسے کروں میرے بغیر گھر نہیں چل سکتا ۔دلشاد بیگم کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی بس خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا ۔تین بیٹے تھے ۔ ہر بیٹے سے مہینہ اکھٹا کرتی تھی ۔پینشن الگ لیتی ۔مہینے کی آمدنی دو لاکھ تھی ۔لیکن چالیس ہزار کی عیدی سال بعد دینے پر ان کا دل گھٹ رہا تھا ۔اتنے میں بیٹی کی سسرال سے عیدی آ گئی ۔ جسے دیکھ کر سعدیہ اتراتی پھر رہی تھی ۔" تم ایسا کرو یہ سوٹ شازیہ کو دے دو ۔دو جوڑے ہیں دوسرا تم پہن لینا دلشاد بیگم نے سعدیہ سے کہا" خبردار جو میرے جوڑوں پر نظر رکھی ۔ میں نے فیضان کو پک سینڈ کی تھی تو وہ میرے پسندیدہ برینڈ کے جوڑے لے کر آیا ہیمیں اپنی عیدی نہیں دونگی" ۔ یہ کہہ کر سعدیہ اپنے کپڑے لے کر بھاگ گئی ۔دو روزے اور گزر گئے برقی گھنٹی بجی ۔دلشاد بیگم اکیلی گھر پر تھی ۔ بیٹا بہو اسپتال گئے ہوئے

تھے۔ چارونا چار جا کر گیٹ کھولا۔ بہو کی عیدی لے کر اس کا بھائی آیا ہوا تھا۔ دلشاد بیگم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا وہ تھوڑی دیر بعد چلا گیا تو دلشاد بیگم نے شازیہ کو کال کی اور عیدی کا بتایا۔ "ابھی اماں کسی سے ذکر نہ کریں میں آتی ہوں شازیہ بھاگم بھاگ بازار گئی دوستے جوڑے خریدے اور ماں کے گھر جا پہنچی۔ اس نے بھابھی کے گھر سے آیا مدر ڈاٹر کولیکشن کا تیس ہزار کا جوڑوں کا سیٹ اٹھایا اور اسکی جگہ وہ سستے دو سوٹ رکھے۔ جو بازار سے لائی تھی اور ماں سے کہا امی میری عیدی میں ان کے ساتھ باقی چیزیں، ایک مردانہ سوٹ، داماد کا اور میرے بیٹے کا لے کر بھیج دیں۔ پھر وہ سامان اٹھا کر بھابھی کے کمرے میں رکھ آئی۔ اچھا امی میں جا رہی ہوں گھر جا کر افطاری بھی بنانی ہے۔ یہ کہہ کر شازیہ چلی گئی۔ عصر کی اذان ہوئی تو دلشاد بیگم کو افطاری کی فکر ہوئی "سعدیہ اٹھ کے کچھ بنا لے "ابھی تو اماں یونی ورسٹی سے آئی ہوں"۔ وہ مہارانی تو پتا نہیں کب آئے گی۔ تو کچھ کر لے۔ سعدیہ نے افطاری بنائی۔ روزہ کھل گیا۔ اسی دوران اسپتال سے فون آ گیا" ہم اماں یہاں پر ہی رکیں گے۔ فروا کا بلڈ پریشر ہائی ہے ڈاکٹر نے ایڈمٹ کر لیا ہے" ٹھیک ہے اچھا ہی ہوا گھر آتی تو عیدی کے جوڑے کا فساد پڑ جاتا۔ وہی مری رہے تو اچھا ہے۔ "اماں آپ کیا سوچ رہی ہیں" شازیہ نے پوچھا" کچھ نہیں رات کو امجد دلشاد کا بیٹا بچے لے کر گھر آ گیا۔ دوسرے دن امجد ہسپتال جانے لگا تو دلشاد نے شازیہ کی عیدی کے لیے کہا۔ اماں میں اسپتال جا رہا ہوں۔ بیٹا پہلے کپڑے خرید کر دے جا تا کہ میں جا کر دے آؤں۔ عید میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ امجد نے پہلے کپڑے لیے۔ مٹھائی اور سویاں خریدی اور گھر لا کر ماں کو دی۔ پھر اسپتال گیا۔ دلشاد بیگم نے ان ڈرائیور منگوائی بچے سعدیہ کے پاس چھوڑ کر شازیہ کے سسرال جا کر عیدی دے آئی۔ دو روزے مزید گزر گئے اور فروا کی سرجری کا فیصلہ ہوا۔ اٹھائیسویں روزے اس کا آپریشن کے ذریعے بیٹا پیدا ہوا۔ اس کی عید تو اسپتال میں ہی گزر گئی۔ گھر آ کر دو ہفتے بعد اس نے الماری میں رکھے عید کے کپڑے کھول کر دیکھے تو حیران رہ گئی اتنے گھٹیا کپڑے اور رنگ بھی پیلا۔ یہ کیا میری ماما نے بھیجے ہیں۔

اس نے ماما کو فون کیا۔" ماما آپ نے کس کلر کے کپڑے بھیجے تھے اور کون سا برینڈ تھا۔" میرون کلر کے تمہارے فیورٹ برینڈ کے مدر ڈاٹر کلیکشن کے جوڑے تھے۔تمہارا اور ملائکہ کا ایک جیسا سوٹ تھا۔کیوں پسند نہیں آئے تمہیں"

ماں نے پوچھا

" نہیں ماما بہت اچھے ہیں" تو پھر پوچھ کیوں رہی ہو"

" کچھ نہیں ماما میرے سر میں درد ہے پھر بات کرونگی۔"

فروا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔کپڑے کہاں گئے؟

اس سوال کا جواب کس سے لوں؟ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ چند دن بعد فیملی واٹ ایپ گروپ میں سکرولنگ کرتے ہوئے عید کی تصویروں پر اس کی نظر پڑی۔شازیہ نے اور اس کی بیٹی نے میرون کلر کے مدر ڈاٹر کلیکشن کے جوڑے زیب تن کرر کھے تھے اتنے مہنگے برینڈ کے کپڑے تو میری ساس کبھی نہیں دیتی۔اس نے پک لی اور کروپ کر کے فیس ہٹا کر ماما کو بھیج دی۔کتنا اچھے لگ رہا ہے تم پر یہ سوٹ لیکن تم نے فیس کیوں کٹ کیا ہوا ہے؟"۔

ماں نے ٹیکسٹ کیا!

ویسے ہی ماما بال سیٹ نہیں تھے اس لیے!

اس نے جوابی ٹیکسٹ کیا۔

مکلّف

ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے افراد خانہ مغرب کی اذان کے منتظر تھے۔جیسے ہی اذان ہوئی سب افطاری کرنے لگے ۔چاٹ کھاتے ہی حماد صاحب کی زبان بد ذائقہ ہوگئی ۔بیگم یہ چاٹ کل کی باسی ہے۔آپ نے تازہ نہیں بنائی ۔" نہیں وہ ٹائم نہیں مل سکا بیگم آہستہ سے بولی ۔" پکوڑے بہت کم بنائے ہیں آپ نے" حماد صاحب نے توجہ دلائی۔اور پودینے کی چٹنی کہاں ہے؟"جی وہ ٹائم کم تھا اس لیے نہیں بنا سکی میں"۔بیگم نے جواباً کہا" بیگم میں نے آپ سے کہا تھا سکنجبیں بنایا کریں یہ لال شربت تو صحت کے لیے غیر مفید ہے۔حماد صاحب بولے۔" کل بنادونگی انشااللہ۔"سالن کیا بنایا ہے"؟"وہ تو آج نہیں بن سکا سحری میں دہی کھالیں گے اور ساتھ آملیٹ بنالونگی" پاپا ماما تو دو گھنٹے یوٹیوب چینل پر لائیو دورہ قرآن کرتی ہیں اس لیے ماما کے پاس ٹائم نہیں ہوتا کوکنگ کا۔ہمیں بھی اسکول بڑی مشکل سے بھیجتی ہیں۔اور لنچ بھی نہیں دیتی ہمیں بہت بھوک لگتی ہے کینٹین بھی بند ہوتی ہے" بڑے بیٹے نے باپ کی معلومات میں اضافہ کیا۔یہ سن کر حماد صاحب خاموش ہو گئے اور سوچ میں پڑ گئے کہ اس مسئلے کا ایسا کیا حل کریں کہ بیگم صاحبہ کی اصلاح بھی ہوجائے اور گھر کا ماحول بھی خوشگوار رہے پھر ان کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔سحری کا ٹائم ہوا میاں بیوی نے روزہ رکھا اور نماز پڑھ کر سو گئے ۔سات بجے الارم بجا۔حماد صاحب نے بیگم کو ہلایا کہ اٹھ کر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرے لیکن بیگم گہری نیند میں تھیں

۔چارو ناچار خود ہی اٹھے بچوں کو جگایا ناشتہ بنا کر کھلایا فرنچ ٹوسٹ تیار کیے بچوں کو لنچ میں دیے۔اتنے میں وین آ گئی بچے اسکول چلے گئے ۔حماد صاحب بھی سونے کے لیے لیٹ گئے ۔نو بجے پھر بیل بجی ۔حماد صاحب نے گیٹ کھولا تو کام والی ماسی تھی ۔"شکر ہے صاحب آپ نے گیٹ کھول دیا۔میں تو روزانہ بیل بجا کر چلی جاتی ہوں باجی گیٹ نہیں کھولتی ہیں پھر میں چلی جاتی ہوں اور دو گھروں کا کام کر کے ایک بجے آتی ہوں تو آپ کا کام کرتی ہوں "ماسی نے کہا، حماد صاحب کیا کہتے بس سنتے رہے۔حماد صاحب لانج میں آ بیٹھے۔صاحب کو سامنے دیکھ کر ماسی بھی دیانت داری سے کام کرنے لگی ورنہ روزانہ تو بس سامنے سے جھاڑو لگا لیتی اور برتن بھی گندے مندے دھو جاتی تھی ۔دس بج گئے پھر الارم بجنے لگا بیگم اٹھ گئی۔حماد صاحب سامنے لانج میں بیٹھے تھے بیگم کی حرکات وسکنات دیکھ رہے تھے لیکن بیگم کو افراتفری کے عالم میں نہ تو لاونج میں بیٹھے ہوئے حماد صاحب دکھائی دیے نہ ہی بیڈ روم کے سائیڈ ٹیبل پر ان کا پرس، گاڑی کی چابی اور گھڑی نظر آئی۔حماد صاحب نے موبائل کا کیمرہ آن کیا اور بیگم صاحبہ کی ویڈیو بنانا شروع کر دی ۔جلدی سے بیگم نے واش روم کا رخ کیا۔وضو کیا۔الماری کھول کے عبایا کھینچا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔حماد صاحب بھی ڈائنگ روم میں چلے آئے اور کرسی پر بیٹھ کر بیگم کی ویڈیو بنانے لگے۔وہ اس زاویے سے بیٹھے کہ بیگم کی نظر ان پر نہ پڑے۔بیگم نے صوفے کے سامنے موجود قد آدم آئینے میں جو انہوں نے یوٹیوب ویڈیو بنانے کے لیے خصوصی طور پر بیڈ روم سے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا تھا اپنا عبایا سیٹ کیا چہرہ کور کیا۔بغور چہرے کا نقاب میں جائزہ لیا بھویں انہوں نے رمضان سے پہلے ہی ترشوائی تھیں جو کہ نقاب میں الگ ہی چھب دکھا رہی تھی مطمئن ہو کر صوفے پر بیٹھ کر خود کو سیٹ کیا۔قرآن پاک کھولا۔سامنے اسٹینڈ میں موجود موبائل آن کیا اور دورہ قرآن کا آغاز کیا۔ویڈیو کا آغاز کرتے ہوئے تعوذ اور تسمیہ کے بعد بیگم صاحبہ گویا ہوئی آج چھٹا روزہ ہے اور چھٹے سپارہ "لایحب اللہ کا ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے بیان کی جائے گی ۔دو گھنٹے بعد لائیو

سیشن ختم ہوا۔ بیگم نے فون کا کیمرہ آف کیا اور نڈھال ہو کر صوفے پر ہی لیٹ گئی۔ دو گھنٹے مسلسل بول کر بیگم کا حلق خشک ہو گیا۔ صاحب نے فون کا کیمرہ بند کیا فون جیب میں ڈالا اور سونے چل دیے۔ ڈیڑھ بج گیا۔ ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ بچے اسکول سے آ گئے۔ بچوں نے ماں کے سر پر کھڑے ہو کر بھوک کا نقارہ بجایا تو بیگم کی آنکھ کھلی۔ "ماما مجھے پراٹھا بنا دیں بیٹا بولا اور مجھے بھی بیٹی نے کہا اچھا۔ ماما نے حامی بھری۔ بیگم کچن کا رخ کرنے لگی تھی کہ یاد آیا گندھا ہوا آٹا تو سحری میں ختم ہو گیا تھا نئی مصیبت وہ دل میں بولی اب کیا ہو گا۔ اتنے میں پھر بیل بجی۔ بیٹا دیکھنے گیا اور پلیٹ کے ساتھ واپس آیا" ماما سامنے والی آنٹی نے بریانی بھیجی ہے۔ ہم دونوں کھا لیں جی "وہ بولی اور کچن میں آ گئی جلدی سے آٹا گوندھ لیتی ہوں حماد صاحب کو پتا نہ چلے۔ اتنے میں حماد صاحب ظہر پڑھ کر آ گئے۔ "آج آپ آفس نہیں گئے بیگم نے پوچھا" نہیں آج میں نے سوچا آپ کی کوکنگ میں ہیلپ کروں گا مل کر افطاری بنائیں گے "۔ وہ بولے "جی بہتر"۔ بیگم نے جواب دیا تو آج کیا کیا بنے گا؟ حماد صاحب نے بیگم سے پوچھا؟ "ایسا کریں چنا چاٹ، دہی بڑے، پکوڑے اور رشین سلاد ساتھ جوس بنا لیں"۔ حماد صاحب نے مشورہ دیا۔ چنا چاٹ نہیں بن سکتی چنے ختم ہو گئے بیگم نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔ "تو میں لے آتا ہوں" حماد صاحب نے کہا" لیکن وہ تو رات کو بھگوتے ہیں پھر صبح ابالتے ہیں" بیگم نے جواب میں کہا۔ حماد صاحب بولے" چلیں کل بنا لیں گے آج باقی چیزیں بنا لیں اور سالن میں دیسی مرغ بنا لیں۔ دیسی مرغ گلاتے گلاتے تو میری ہڈیاں گل جائیں گی۔ بیگم بڑبڑائی۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" حماد صاحب نے پوچھا" نہیں ابھی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں بیگم یہ کہہ کر کام میں لگ گئی۔ جیسے تیسے بیگم نے افطاری بنائی حماد صاحب نے بھی مدد کی۔ مغرب کی اذان میں آدھا گھنٹہ رہ گیا کہ ٹیبل سج گئی۔ "ماشاءاللہ سارا کام ٹائم سے ہو گیا کتنا اچھا لگ رہا ہے حماد صاحب نے بیگم سے کہا"۔ جی "وہ بولی اور اندر کی طرف جانے لگی" آپ کہاں چل دی حماد صاحب نے استفسار کیا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں

ذرا کمر سیدھی کرلوں" بیگم نے پژمردہ انداز میں کہا۔" کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کریں آپ جناب" حماد صاحب لاڈ سے بولے۔شوہر کی اطاعت کا ثواب کمالوں یہ سوچ کے بیگم صوفے پر بیٹھ گئی "میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں بیگم صاحبہ "۔صاحب نے کہا" نہیں میں روزے کی حالت میں ٹی وی نہیں دیکھتی نیٹ یوز نہیں کرتی بس روزے کی حفاظت کرتی ہوں ۔" بیگم بولی۔اتنے میں ٹی وی آن ہوگیا حماد صاحب نے فون ٹی وی سی کنیکٹ کر کے ویڈیو آن کردی جو صبح میں بنائی تھی۔اب بیگم کے چہرے پر ایک رنگ آئے ایک رنگ جائے۔شرمندہ ہوگئی۔حماد صاحب گویا ہوئے" میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں ہے۔۔عورت کی پہلی ترجیح اس کی اولاد ہے۔اس کا گھر ہے۔اس سے جڑے ہوئے رشتے ہیں۔اولاد کی دینی تربیت ہی اولاد کو والدین کے لیے صدقہ جاریہ بناتی ہے۔تبلیغ عورت کے ذمے نہیں ہے۔آپ دین کی تعلیم دینا چاہتی ہیں تو بچوں اور خواتین کو گھر پر بلا سکتی ہیں۔یوٹیوب کے ذریعے سے تو یہ نامناسب ہے عورت کی آواز پردہ ہے آپ نے بے شک پردہ کر رکھا ہے لیکن آپ کا سراپا تو ویڈیو میں دکھائی دے رہا ہے۔جو کہ درست نہیں ہے اسلام عورت کو تبلیغ کا مکلّف نہیں کرتا۔مجھے امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہونگی۔۔۔

قربانی

اختری نے گھر کا کام ختم کیا اور سفید تکیہ پوش پر رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے پھول کاڑھنے لگی اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔اسے یہ کام جلدی مکمل کرنا تھا اختری یتیم تھی اس کا بچپن بہت کسمپرسی کے عالم میں گزرا تھا۔باپ اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی چل بسا تھا۔ایک بڑی بہن تھی اور ایک ماں ۔ماں محنت مزدوری کر کے ان دونوں بہنوں کو پال رہی تھی ۔اکثر گھر میں کھانے کے لیے صرف روٹی ہوتی جب وہ ماں سے پوچھتی اماں! روٹی کس کے ساتھ کھائیں؟

ماں جواب دیتی: منہ کے ساتھ۔۔

جیسے تیسے کر کے اس کا بچپن گزر گیا۔وہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے کو سلائی کڑھائی کرنے لگی۔لیکن یہ چادر اور تکیے اس کے جہیز کے تھے۔ان پر لگے ہر ٹانکے میں اس کے ارمان پروئے ہوئے تھے۔ان کے رنگوں میں اس کے خواب سجے تھے۔کنواری آنکھوں میں سجے ایک شہزادے کے خواب جس کا ساتھ اس کی زندگی کو دل کش بنادے گا۔

اس کا تعلق مشترکہ ہندوستان کے گاں گورداسپور سے تھا۔یہ جنوری 1947 کا زمانہ تھا جنگ آزادی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔اکثر گلی میں سے گزرتے جلوسوں کے نعرے سنتی اختری مستقبل کے اندیشوں سے لاعلم تھی۔اس کی عمر 14 سال تھی۔اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد صرف گھر کی چار دیواری دیکھی تھی۔سیاست کی موجودہ صورت حال سے وہ بے خبر تھی۔کبھی اماں سے پوچھتی کہ جلوس کیوں نکلتے ہیں تو وہ جواب دیتی، یہ لوگ انگریز سرکار سے آزادی مانگتے ہیں

آزادی کیا ہوتی ہے یہ سوال اس کے لیے عجیب تھا کیونکہ وہ ان پڑھ تھی ،قرآن اور نماز کی تعلیم ماں نے دی تھی اس کے نزدیک دین کا علم ہی کل علم تھا۔دنیاوی علم سے وہ بے بہرہ تھی ،دو ماہ بعد اس کی شادی طے تھی

شادی کا دن آ پہنچا، ماں نے اپنی حیثیت کے مطابق اسے چار چیزیں دے کر رخصت کر دیا، سسرال میں ساس، شوہر اور دیور تھے۔نئی نئی شادی میں دہکتے جاگتے ارمانوں کا ایک جہان آباد تھا۔ یہ دنیا اتنی خوبصورت تھی کہ وہ ماضی کی سب محرومیاں بھول گئی ۔اس کا شریکِ حیات اس کے مقابلے میں بہت بہتر تھا پڑھا لکھا اور وجیہہ، اس کا شوہر سرکاری ملازم تھا۔وہ ایف ۔اے پاس تھا اور محکمہ ڈاک میں کلرک تھا، خوابوں کے ہنڈولے میں جھولتے چند ماہ لمحوں کی طرح گزر گئے ، ملک میں فسادات پھوٹ پڑے ،حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے ،ان کے سارے خاندان نے ہجرت کی ٹھانی ،ضرورت کے چند کپڑے گھٹڑیوں میں باندھے ، وہ جہیز جو اس نے بہت چا سے بنایا تھا حسرت بھری نظر اس پر ڈالی اور رات کی تاریکی میں سسرال والوں کے ساتھ گلی کی طرف قدم بڑھا دیے، وہ لوگ چھپتے چھپاتے شہر سے باہر جانے والی سڑک کی طرف بڑھنے لگے، دبے پاں چلتے چلتے وہ شہر سے باہر نکلے، آبادی ختم ہوگئی تو قدموں کی رفتار بھی تیز ہوگئی، درختوں کی اوٹ میں ایک قافلہ ان کا منتظر تھا، جس میں زیادہ تر خاندان ان کی برادری کے تھے، قافلے چلنے میں ابھی وقت تھا کیونکہ کچھ اور خاندانوں کا انتظار تھا۔۔

اس کی ماں اور بہن پہلے ہی پہنچ چکی تھیں، اگست کا مہینہ اور ساون کا موسم تھا، گزشتہ رات ہونے والی بارش کی وجہ سے میدانی علاقہ کیچڑ زدہ تھا۔اسی گرمی ،حبس اور کیچڑ میں سب لوگ ڈرے سہمے کھڑے تھے ۔گھٹڑیاں سروں پہ رکھی ہوئی تھیں اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی ۔اللہ خیر کرے۔۔۔قافلے والوں کی زبان سے پھسلا ،چشم زدن میں گھڑسوار قافلے والوں کے سروں پر تھے،

ان کے ہاتھوں میں کرپانیں اور سروں پر پگڑیاں تھیں، یہ سکھ حملہ آور تھے، کاٹ دوان مسلوں کو کوئی نہ بچے ۔۔۔۔صدا بلند ہوئی، لہو کا بازار گرم ہو گیا، مسلمان کٹ کے گرنے لگے ان کے پاس نہ تو ہتھیار تھے نہ ہی گھوڑے، جان بچا کے جس طرف بھاگتے کوئی گھڑ سوار گھوڑے کو ایڑ لگا تا اور سر پہ آ پہنچتا۔

اختری کا شوہر اور دیور بھی مارے گئے ۔چند عورتیں رہ گئیں، باقی سب شہید کر دیے گئے ، ان عورتوں کو گھڑ سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں پہ لا دا اور رات کی تاریکی میں گم ہو گئے ،شوہر کو گرتا دیکھ کے اختری ہوش وحواس کھو بیٹھی ، رات گزر گئی ، دن کا اجالا نکلا، گرمی کی شدت سے اختری کو ہوش آیا تو چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں اور وہ اکیلی زندہ تھی ۔اختری نے واپسی کے راستے کی طرف جانے کا سوچا اور شہر کی طرف چل پڑی، وہ ہندوں اور سکھوں سے چھپتی چھپاتی اپنے گھر کی طرف جانے لگی گلی سے اندر داخل ہوئی تو گھر سے دھواں نکلتے دیکھا، دشمنوں نے گھر کو لوٹ کے بقیہ سامان جلایا تھا، نہ مکین رہے نہ گھر وہ اندر داخل ہوئی اور ایک کونے میں لیٹ گئی، گزرا وقت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ،وقت نے کھل کے رونے بھی نہ دیا ،زندگی کیا سے کیا ہو گئی ۔۔انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی ،آج یہاں جشن مناتے ہیں ، تین ہندو ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے گھر میں داخل ہوئے ۔۔۔اختری نے ارد گرد نظر دوڑائی اپنی حفاظت کے لیے کوئی چیز نظر نہ آئی ، وہ برآمدے میں بیٹھ گئے اور شراب پینے لگے، اختری اندر کمرے کے دروازے کی درز سے انہیں دیکھنے لگی، ان میں سے ایک اٹھا اور بولا ،تھک گیا ہوں آرام کرلوں ۔وہ اختری والے کمرے کی طرف بڑھا اختری پیچھے ہٹی اور کسی برتن سے جا ٹکرائی ۔۔۔اندر جانے والے نے چاقو نکال لیا، شور کی آواز سے باقی دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے ،کوئی ہے ۔۔۔ یہاں کوئی ہے ۔۔

لڑکی ہے، پہلے والا بولا

باقی دو کے منہ سے نکلا ۔۔۔لڑکی

پہلے والا ہاتھ میں چاقو لے کر اختری کی سمت بڑھا، اختری پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی، باقی دو بھی پہنچ گئے، ایک نے جھپٹا مار کے اختری کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اختری نے چاقو والے سے چاقو چھینا اور میں اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا، اختری نیچے بیٹھتی گ ء، ی فرش پہ خون پھیلنے لگا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

مر گئی سالی

ان میں سے ایک بولا۔۔۔

زعتر و زیتون

(فلسطینی شاعر ڈاکٹر عمر حرب کی زندگی سے ماخوذ کہانی)

پروفیسر عثمان نے زیتون سے بھرا ہوا تھیلہ اپنی اہلیہ کے سپرد کیا۔"یہ تازہ پھل آپ کو کہاں سے ملا "۔بیوی نے استفسار کیا۔"میرا ایک طالب علم اپنے باغ سے تحفتاً لایا ہے پروفیسر عثمان نے جواب دیا اور اپنے رائٹنگ ٹیبل کا رخ کیا۔رائٹنگ ٹیبل کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی تھی باہر کا منظر بہت خوبصورت تھا ۔اکتوبر کی غزہ کی یہ شام زندگی اور توانائی سے بھرپور تھی۔" مشتھی السکنی "نامی اس رہائشی عمارت میں پروفیسر عثمان کو رہتے ہوئے دس سال کا عرصہ ہوگیا تھا۔پروفیسر ڈاکٹر عثمان بہت اچھے شاعر تھے وہ ملی شاعری کے لیے مشہور تھے۔اپنے وطن سے محبت کے ترانے ان کے قلم سے نکلتے اور فلسطین کی آزادی کی آواز بن کر ہواں میں گونجتے۔ان کے چار بیٹے دو بیٹیاں اور تین پوتے اور چار نواسے تھے دو پوتیاں اور ایک نواسی تھی۔ویک اینڈ پر سب بچے ان کے گھر ہر جمع ہوجاتے بچوں کی کلکاریوں سے گھر گونجنے لگتا۔۔فلسطینوں کی آزادی کی جنگ حماس کے تحت جاری تھی۔سات اکتوبر 2023 کو فلسطین کی مزاحمتی تحریک حماس کی طرف سے بڑا حملہ کیا گیا۔اس کے بعد اسرائیل نے غزہ پر فضائی بمباری کا آغاز کردیا۔اس بمباری کے نتیجے میں کثیر تعداد میں شہادتیں ہوئی۔پروفیسر عثمان کی یونیورسٹی بھی منہدم ہوگئی ۔فلسطین کے حالات خراب ہوگئے۔غذا کی شدید قلت پیدا ہوگئ۔بھوک سے معصوم بچے اور بے گناہ لوگ مرنے لگے۔پروفیسر عثمان مقامی لوگوں کی مدد کرنے لگے۔بے گھر افراد جن کے گھر مسمار ہوچکے تھے۔خیمہ بستی میں رہنے لگے۔اسرائیلی حملے کے بعد یہ خیمہ بستی آگ کی لپیٹ میں آ گئی اور کئی افراد

جھلس کے شہید ہو گئے۔ پروفیسر عثمان نے حماس کے ساتھ کام شروع کر دیا ان کے جوان بیٹے اور داماد بھی ان کے ساتھ آزادی مشن میں شامل ہو گئے۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے وہ تمام توانائیوں کے ساتھ سرگرم عمل تھے کہ انہیں کینسر جیسا موذی مرض ہو گیا۔ علاج کی ناکافی سہولتیں اور خوراک کی کمی ناتوانائی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اسپتال اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں تباہ ہو چکے تھے۔ شہادتوں کے باعث ماہر ڈاکٹرز کی کمی پیدا ہو چکی تھی۔ پروفیسر عثمان کا وزن تیزی سے گرنے لگا۔ صحت دن بدن خراب ہونے لگی۔ دسمبر 2023 میں اسرائیلیوں نے پروفیسر عثمان کے گھر پر حملہ کر دیا ان کے بیوی بچے اور بچوں کے بچے سب شہید کر دیے گئے۔ ستائیس افراد کی شہادت کے وقت پروفیسر عثمان ناصر ہسپتال میں داخل تھے۔ اپنوں کی اموات، درد، غم، بیماری، بھوک نے پروفیسر عثمان کو نڈھال کر دیا۔ نو ماہ موت سے لڑنے کے بعد پروفیسر عثمان خانیوس کے ناصر ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ دیگر فلسطینیوں کی طرح ان کے دل میں ایک ہی جذبہ تھا کہ ہم باقی رہیں گے، جیسے زعتر اور زیتون باقی ہیں۔ زعتر مزاحمت کی خوشبو ہے اور زیتون فلسطین کی پہچان ہے۔۔۔۔۔

سحر المحبۃ

کمرے کی فضا میں نحوست چھائی ہوئی تھی ۔اندھیرا اور اس اندھیرے کا حصہ وہ کالا کلوٹا عامل منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔اس کے سامنے بیٹھی دو عورتیں عامل کے بولنے کی منتظر تھیں ۔" کام ہو جائے گا لیکن رقم تگڑی لگے گی "" میں بھرنے کو تیار ہوں بس میرے بیٹے کی جان چھڑا دو۔ٹھیک ہے دو لاکھ میں کام ہو جائے گا۔فربہی مائل پتھر دل عورت نے پرس سے مطلوبہ رقم نکال کر عامل کے سامنے رکھ دی ۔"لڑکی اور لڑکی کی ماں کا نام لکھوا دو" عامل بولا " جان سے مارنا ہے یا صرف لڑکے کا پیچھا چھڑوانا ہے"۔عامل نے پوچھا " نہیں نہیں جان سے نہیں مارنا بس جان چھڑوادیں عورت بولی " ٹھیک ہے تم لوگ جاوہ دونوں باہر آ گئی اور رکشے کا انتظار کرنے لگی ۔شکیلہ نامی عورت جس نے اپنے بیٹے کے لیے رقم دی تھی ۔ اپنی رشتہ دار ثریا سے کہنے لگی " میں تو خدا سے ڈرتی ہوں حاجی نمازی ہوں ۔ بہت نیک ہوں کبھی غلط کام نہیں کیا۔" بس بھابھی کیا کریں بہت برے لوگ ہیں زمانہ خراب ہے۔مجبور ہیں آپ ۔قسمت میں یہ ہی لکھا ہے"۔اپنے برے عمل کی ان کے پاس کئی توجیہات تھیں ۔گھر پہنچ کر شکیلہ بیگم نے بہت اہتمام سے نماز ادا کی ۔انہیں اپنے فعل پر ذرا سی بھی شرمساری نہیں تھی ۔کالے جادو کے اثرات آہستہ آہستہ سامنے آنے لگے ۔شکیلہ بیگم کا بیٹا احسن جو صبا کے عشق میں دیوانہ تھا۔اب وہ ملاقاتوں میں پہلے جیسا رومانوی انداز اختیار کرنے سے ہچکچانے لگا۔صبا اس کے بدلتے رویے سے پریشان ہونے لگی ۔صبا

اسکے دور پار کے رشتہ دار کی بیٹی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ یہ محبت جسمانی تعلقات تک پہنچ گئی تو دونوں نے چھپ کر نکاح کر لیا۔لیکن اب وہی احسن صبا سے تنگ پڑنے لگا تھا۔اس کا دل صبا سے متنفر ہونے لگا۔اوراس نے ایک دن صبا کو ایک آدمی کے ساتھ دیکھ کراس سے بہت جھگڑا کیا۔جھگڑا اس قدر بڑھا کہ اس نے صبا کو طلاق دے دی۔شک نے ان کے تعلق کو کھا لیا۔شکیلہ بیگم بہت خوش ہوئی۔ایمان کے بدلے انہوں نے دنیا کا سودا کیا تھا جوانکے خیال میں نفع بخش تھا۔دنیا کی زندگی جو بہت مختصر ہے اس زندگی کے لیے انہوں نے آخرت بیچ دی۔وہ دین جس میں کالا جادو کروانے والے کو کافر قرار دیا گیا ہے۔انہوں نے اس دین پر ایک شیطانی عمل کو فوقیت دی۔اب شکیلہ بیگم نے اپنی پسند سے بیٹے کی شادی کروادی۔وقت گزرتا گیا۔صبا کی شادی بھی ہوگئی۔دونوں تین تین بچوں کے ماں باپ بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شکیلہ بیگم ضعیف ہونے لگی۔اسے بیماریوں نے گھیر لیا۔وہ معذور ہو کر رہ گئی۔اس کے پیٹ میں پانی پڑ گیا۔گردے خراب ہو گئے پیشاب پر کنٹرول ختم ہو گیا۔گندگی میں پڑی رہتی کوئی اسے نہ پوچھتا۔ملازمہ دن میں ایک بار اسے صاف کر کے چلی جاتی پھر سارا دن وہ ہوتی اور اس کی گندگی۔مکھیاں بھنبھاتی رہتی۔بدبو اسے نتھنوں میں گھستی تو اسے برسوں پہلے کی ایک بدبو یاد آتی ایک غلیظ کمرے کی نحوست زدہ بدبو۔ایک دن وہ مرگئی۔دفنا دی گئی۔جب فوت ہوئی تو اس کا بڑا پوتا دس سال کا تھا۔چند مہینوں میں زندگی معمول پر آ گئی۔احسن کو ایک دن بازار میں صبا نظر آئی۔دونوں کی ملاقات ہوگئی تو پرانا دبا ہوا پیار جس پر شکیلہ بیگم نے کالے جادو کا بند باندھا تھا۔دوبارہ جوش مارنے لگا۔صبا کا شوہر ملک سے باہر تھا۔کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔صبا ایک فلیٹ میں بچوں اور ملازمہ کے ساتھ رہتی تھی۔اب ملاقاتیں ہونے لگی۔جسمانی تعلقات پھر قائم ہو گئے۔سیر سپاٹے ہونے لگے اور ایک دن احسن کی بیوی شمائلہ نے انہیں دیکھ لیا۔شمائلہ نے راکھ کریدی تو اصل کہانی پتا چل گئی "مکار بڑھیا اپنا آوارہ زانی بیٹا میرے پلے باندھ گئی۔اور خود ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی منحوس۔" شمائلہ نے خود سے

کہا۔شمائلہ کو اور تو کچھ نہ سوجھا اپنی بڑی بہن کے گھر کا رخ کیا جو کہ اسی شہر میں رہتی تھی ۔شمائلہ کی بپتا سن کر بڑی بہن نے مشورہ دیا کہ تم اس عورت کے گھر پر جا کر شور مچاؤ اور اسے بدنام کرو۔دونوں بہنیں صبا کے فلیٹ پر پہنچی اور خوب شور مچایا۔مجمع اکھٹا ہو گیا انہوں نے صبا کے لیے رکیک زبان استعمال کی اور اسے خوب گالیاں دی۔صبا نے سکیورٹی کو فون کر دیا۔سکیورٹی نے آ کر دونوں بہنوں کو وہاں سے بھگا دیا ۔اس کے بعد صبا نے بھی انتقام لینے کا سوچا اور اس نے ایک ہندو عامل سے سحر المحبتہ نامی جادو کروا دیا ۔جادو کے اثرات نے احسن کو مجنوں بنا دیا۔اس نے صبا سے شادی کی ٹھان لی لیکن اب سب سے بڑی رکاوٹ صبا کا شوہر اختیار بیگ تھا۔جب اختیار بیگ وطن واپس آیا تو صبا نے طلاق مانگ لی۔پوری کہانی جان کر اختیار بیگ اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی۔صبا کے راستے کی رکاوٹ دور ہو گئی اس نے عدت پوری کر کے احسن سے نکاح کر لیا۔ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں ۔اڑتی اڑتی خبر شمائلہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی ۔اب وہ کیا کرتی بچوں کا ساتھ تھا مائیکہ بھی غریب تھا سو صبر کر کے بیٹھ گئی۔صبا کا دیوانہ احسن اسے ساتھ ساتھ لیے گھومتا پھرتا۔زمانے بھر کو خبر ہو گئی ۔شمائلہ کی ساس کا کیا کالا جادو مکافات بن کر شمائلہ کے گھر میں ناچنے لگا وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی شیطانی اثرات سے نہ بچ سکی ۔اس نے بہت کوشش کی لیکن احسن نے صبا کو چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔شمائلہ نے شوہر کا انتقام بچوں سے لینا شروع کر دیا۔بچے لاپرواہ، نالائق ،سست ،کاہل اور کام چور بن گئے ۔احسن کی کمائی دو گھروں میں تقسیم ہو گئی۔شمائلہ کی مالی حالت بھی خراب ہونے لگی۔کہ ایک دن صبا اور احسن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔دونوں جان بحق ہو گئے ۔شمائلہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سوکن کے مرنے کی خوشی منائے یا شوہر کی وفات کا سوگ منائے ۔روتے دھوتے وقت گزر گیا تو اب کھانے کمانے کی فکر ہوئی ۔پڑھی لکھی تو تھی نہیں کہ کہیں کوئی نوکری کر لیتی ۔اب بچے اس کی جان کو آ گئے ۔جیسی تربیت کی تھی ویسا نتیجہ ملنے لگا۔گھر میں فاقے پڑ گئے ۔گھر میں فاقے پڑ گئے ۔گھر کے حالات سے تنگ آ کر شمائلہ نے ایک فیکٹری میں

ملازمت کرلی اور گھر کی گاڑی کھینچنے لگی۔وہ مرنے والوں کے ساتھ مر تو نہیں سکتی تھی۔لہذا جینے والوں کے ساتھ جینے لگی۔--------------------

میرے درد کی داستان

انسانی ریلہ بپھر جائے یا سیلابی ریلہ دونوں پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے ۔ مارچ 1971 کا اواخر تھا۔ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان فوجی دستے بھیجے جانے لگے ۔ایسے ہی ایک دستے میں کیپٹن علی رضا بھی شامل تھا۔ بائیس دسمبر کی رات تھی اس نے میز پر ایک رقعہ چھوڑا جس میں لکھا ہوا تھا" میرے لیے دعا کریں مشرقی پاکستان جا رہا ہوں"۔ضعیف والدین کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ سی ۔ون ۔تھرٹی کے ذریعے کراچی ائیر پورٹ سے ڈھاکہ ائیر پورٹ روانہ کیا گیا۔اپنے گھروں ،اپنے شہروں اور اپنے پیاروں سے 1600 کلومیٹر دور یہ فوجی جن کا دستہ افسروں اور جوانوں پر مشتمل تھا اس وقت نہیں جانتے تھے کہ چند روزہ خراب امن وامان کی یہ صورت حال چند مہینوں سے ہوتی ہوئی نو ماہ پر پھیل جائے گی۔ یہ فوجی آپریشن سرچ لائٹ کو عام آپریشن کی طرح اپنی روٹین کی ڈیوٹی سمجھ رہے تھے۔ ائیر پورٹ سے چھانی پہنچے تو انہیں راستے میں موجود بنگالیوں کے وجود غربت زدہ اور چہرے افلاس زدہ نظر آئے ۔ جب ان بنگالیوں سے ٹاکرا ہوا تو انکے دل نفرت سے بھرے ہوئے تھے ۔جس دن قائد اعظم نے اردو زبان کو قومی زبان قرار دیا تھا یہ اس دن سے ناخوش تھے ۔ سیاسی فیصلوں کے باعث محرومیاں انہیں بغاوت پر آمادہ کر رہی تھی ۔انکا احتجاج دن بدن بڑھتا گیا اور پر تشدد ہوتا گیا۔کیپٹن علی رضا کی ڈیوٹی آرڈیننس فیکٹری میں لگی ہوئی تھی ۔ وہ پی ۔اے ایف میس میں گپ شپ کے لیے آتا جاتا رہتا تھا۔ساتھ ہی ڈھاکہ کلب تھا وہاں سے تازہ ترین خبریں بھی اسے مل جاتی تھی ۔فوجی اپنے فرض کی

ادائیگی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے۔کیپٹن علی رضا بینک تنخواہ نکلوانے گیا تو اسے انکار سننے کو ملا ان فوجیوں کی تنخواہ میں سے زیادہ حصہ روک دیا گیا۔اور انہیں راشن کی سپلائی بھی روک دی گئی۔ جب راشن کے حصول کے لیے فوجیوں نے منڈی کا رخ کیا تو تصادم ہوا اور کئی فوجی مارے گئے۔ دن بدن حالات خراب ہوتے گئے۔فوجیوں کی چھاؤنیوں کے گرد گھیرا ڈالا گیا۔ان پر پانی کی سپلائی بند کر دی گئی۔ پاکستانی فوجیوں کے دشمن بظاہر باغی تھے۔لیکن مکتی باہنی جو بھارت سے ٹریننگ لے رہی تھی وہ گوریلا کاروائیاں کرنے لگی۔موسم کا اتار چڑھا، دلدل، دریا،طبی سہولیات کی کمی،خوراک کی کمی، دیگر سہولیات کی کمی،بجلی کی عدم دستیابی اور پھر بھارت کا حملہ ان سب نے فوجیوں کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا۔ فوج کا مورال دن بدن گرنے لگا۔باغی حملے کر کے فوجیوں کو مارنے لگے۔شورش کو کچلتے کچلتے خانہ جنگی جنگ میں بدل گئی۔جس وقت علی رضا جیسور میں تعینات تھا۔وہاں حملہ ہوا تو بمشکل اس کی جان بچی۔ ازلی کمینے دشمن بھارت نے عالمی سطح پر روس کو اپنے ساتھ ملا لیا۔جنرل سیم مانکشیا نے برسات گزرنے کا انتظار کیا۔اور نومبر میں پاکستان پر سرحدی حملہ کر دیا۔پاکستان کو بہت سارے محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑا۔اپنے دشمن بن گئے اور غیر ٹوٹ پڑے۔اسی جنگ کی آڑ لے کر بنگالیوں نے بہاریوں کا قتل عام کیا ۔ان کی خواتین کی بے حرمتی کی۔انہوں نے پاکستانی فوجیوں کو بدنام کرنے کے لیے الزامات ان پر لگائے۔نومبر انیس سو اکہتر میں کشیدگی بہت بڑھ گئی۔پاکستان ائیر فورس کے لڑاکا طیارے ڈھاکہ رن وے پر اترنے لگے۔ان طیاروں کے پائلٹس میں علی رضا کا بڑا بھائی ونگ کمانڈر احسان رضا بھی تھا۔ مشرقی پاکستان جاتے ہوئے اس نے اپنے والدین کو فون کیا تو اس کی والدہ نے کہا" پہلے چھوٹا چلا گیا اب تم بھی جا رہے ہو۔جب کہ اس کے والد بولے بیٹا پاکستان کو مقدم رکھنا"۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی تو چھوٹا بڑے کے گلے لگ کے رونے لگا" یہاں حالات بہت خراب ہیں بھائی جان۔ ہمارا زندہ واپس جانا ممکن نظر نہیں آ رہا۔بڑے بھائی نے تسلی دی اور کہا" موت برحق ہے جہاں لکھی ہے

وہی آئے گی ۔ ہم نے حلف اٹھایا ہے پاکستان سے وفاداری کا ۔ ہم اپنا وعدہ نبھائیں گے ۔ امی ابو تمہارے لیے دعا کر رہے ہیں حوصلہ رکھو یہ وقت بھی گزر جائے گا"۔ شروع میں شہید فوجیوں کے جسد خاکی جہاز سے انکے آبائی علاقوں میں پہنچائے جاتے تھے ۔ بعد میں حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ یہ بھی ممکن نہیں رہا ۔ چار دسمبر کی رات تھی ۔ بھارتی ہوائی جہازوں نے ڈھاکہ رن وے پر شدید بمباری کی ۔ ان کا مقصد تھا کہ رن وے نا قابل استعمال بنا دیا جائے ۔ ونگ کمانڈر احسان رضا اور اسکوارڈن لیڈر قمر عباس نے جوابی کاروائی کی ۔ انہوں نے دشمن کے طیاروں کا پیچھا کیا ۔ ونگ کمانڈر عباس رضا مسلسل جہاز کی دم پر حملہ کرتے رہے آخر کار جہاز تباہ ہو گیا اور بھارتی پائلٹ مر گیا ۔ دن بھر رن وے کی مرمت کی گئی اور اسے استعمال کے قابل بنایا گیا ۔ پاکستان ائیر فورس دلیری سے مقابل کر رہی تھی ۔ پاکستان کے چھ جہاز تباہ ہو گئے ۔ ایک دس کا مقابلہ تھا ۔ آرمی کی صورت حال بھی مختلف نہ تھی فوجیوں کی اموات کے باعث نفری کم ہو گئی رضا کار بھرتی کیے گئے تو اسلحہ کم پڑ گیا ۔ بنگالی فوجی دشمن کے ساتھ مل گئے ۔ زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے کمیونیکیشن نہ ہونے سے حالات مذید خراب ہوئے ۔ پاکستان کا وہ حصہ جہاں سے تحریک آزادی شروع ہوئی تھی جہاں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی اب وہاں کے لوگ بنگلہ دیش کے نعرے لگا رہے تھے ۔ فوجیوں کو تمہارا پاکستان کا طعنہ دے رہے تھے ۔ جنگ بڑھتی گئی پھیلتی گئی انسانوں کو نگلتی گئی ۔ جنگ میں شدت آ گئی اور گورنر ہاس ڈھاکہ کو نشانہ بنایا گیا ۔ گورنر ہاس کا ایک حصہ منہدم ہو گیا ۔ گورنر عبدالمالک اس وقت بہت خوف زدہ ہوئے اور انہوں نے استعفی دے دیا ۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے ہاتھ میں فوج کی کمان تھی ۔ ڈوبی ہوئی کشتی کو ڈبونے کا الزام بھی بعد میں ان پر لگا ۔ جنگ جاری تھی کہ ونگ کمانڈر احسان رضا کی شہادت کی خبر آ گئی ۔ وہ بھارتی طیارے سے نبرد آزما تھے کہ ایک گولہ لگا اور انکا جہاز کریش ہو گیا ۔ جہاز گرا اور آگ لگ گئی انکی جلی ہوئی ڈیڈ باڈی کی تدفین ان کے بھائی کیپٹن علی رضا کی موجودگی میں کردی گئی ۔ تار کے ذریعے فوج کی طرف

سے اور خط کے ذریعے کیپٹن علی رضا کی طرف سے والدین اور ونگ کمانڈر احسان رضا کے اہل خانہ کو اطلاع دے دی گئی ۔کیپٹن علی رضا تو بالکل ہمت ہار بیٹھا۔مشرقی پاکستان کی انتظامیہ دم توڑ چکی تھی ۔ دشمن کی فوجیں ڈھاکہ کے قریب پہنچ گئی تھی اور شہر کے اطراف میں گھمسان کی لڑائی جاری تھی ۔کومیلا ، چٹاگانگ اور سلہٹ پر فضائی حملے ہورہے تھے ۔ پاکستانی فوج کو کمک نہیں پہنچ رہی تھی ۔ یونیفارم میں موجود تمام فورسز کی لڑائی کے ساتھ ساتھ پولیس اور نیم فوجی دستوں نے بھی جنگ لڑی ۔اس آخری معرکے کے لیے چند مارٹر گنیں ،ٹینکوں کا ایک سکواڈرن ، اینٹی ٹینک اور مشین گنیں دستیاب ہوسکی ۔گیم پاکستان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔اگر فوج لڑتی رہتی تب بھی وہ کتنا عرصہ انڈین فوج کو ڈھاکہ سے دور رکھ سکتی تھی ۔ جرنیلوں کے مشترکہ مشورے سے جنگ بندی کا فیصلہ ہوا۔فوجیوں کی ٹولیاں مشرقی پاکستان کے مختلف محاذوں سے ڈھاکہ پہنچنے لگی ۔ایسٹرن کمانڈر کا ہیڈکواٹر ویران ہوگیا۔اور قائداعظم کا پاکستان پندرہ دسمبر کو ٹوٹ گیا ۔ رمنا ریس کورس گراونڈ میں جنرل نیازی اور جنرل جگجیت اروڑا نے جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کیے ۔ جنرل نیازی نے ریوالور جنرل اروڑا کو پیش کیا۔ بہت بڑی تعداد میں بنگالی بھیڑ یہ منظر دیکھ رہی تھی یہ ایسا سیاہ دن تھا کہ ایک کافر سکھ جس کے ہم مذہب لوگوں نے تقسیم ہندوستان پر مسلمانوں کا لہو بہایا تھا۔عورتوں کی عزتیں لوٹی تھی املاک کو تباہ کیا تھا۔آج یہ ہی سکھ بنگالی مسلمانوں کے لیے قابل اعتماد ہو گئے تھے ۔اور ہم وطن پاکستانی مسلمان ناقابل اعتبار اور غاصب کہلائے ۔ پاکستانی فوجی افسران ہتھیار ڈالنے کے لیے گالف کورس میدان میں قطاروں میں کھڑے تھے ۔ جنرل جمشید نے فوجی افسروں سے کہا" ہتھیار برزمین شو اور سب نے ہتھیار فرش پر پھینک دیے ۔پہل جنرل فرمان نے کی باقی فوجیوں نے ان کا اتباع کیا۔ان فوجیوں میں کیپٹن علی رضا کا سرخ سفید چہرہ بھی تھا جو خفت سے سرخ تھا۔خفت ،خجالت اور بے بسی کی یہ کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ جنگی قید کی صورت میں یہ صورت حال اڑھائی سال پر پھیل گئی ۔فوجیوں کو آگرہ میں بنے جنگی کیمپوں میں منتقل کیا گیا۔کیپٹن

علی رضا کی بھائی کی جدائی کا زخم ابھی تازہ تھا اور بھارت کے ہاتھوں ہوئی ذلت کا احساس بھی نیا تھا۔ دوسری طرف اس کے والدین بھابھی اور بھائی کے بچے بھی افسردہ اور رنجیدہ تھے۔ جیل میں ناکافی سہولتوں، علاج کی کمی اور موسم کی سختی کے ساتھ ساتھ راشن کی بھی کمی تھی۔ قیدی بچارے اپنے کپڑے خود سیتے تھے۔ مسائل کے حل کے لیے مختلف جگاڑیں کرتے رہتے تھے۔ کچھ حضرات کے ذہن پر اثر ہو گیا وہ نفسیاتی اور دماغی مریض بن گئے۔ کچھ سرنگیں کھود کے قید سے بھاگنے کی تدابیر کرنے لگے۔ نماز روزے کا اہتمام بڑھ گیا۔ نفلی عبادات کے لیے اب وقت ہی وقت تھا۔ کھیل کود پی ٹی جیسی سرگرمیاں بھی کی گئی لیکن آخر کب تک جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ مایوسی دلوں میں جگہ بنانے لگی۔ کیا ہم کبھی پاکستان جاسکیں گے؟ یہ وہ سوال تھا جو جنگی قیدی خود سے کرتے رہتے۔ وہ اخبار پڑھتے۔ ریڈیو سنتے۔ گھر والوں کو خط لکھتے۔ ریڈ کراس سے ملے تحفے لے کر خوش ہوتے۔ گھر والوں کی بھیجی ہوئی سوغاتیں استعمال کرتے۔ پاک بھارت معاہدے کی کوئی بازگشت سنائی دیتی تو وہ پرامید ہو جاتے جب یہ امید ٹوٹتی تو وہ غم گین ہو جاتے۔ عیدیں آئی گزر گئی۔ 14 اگست آئی چلی گی۔ 16 دسمبر آیا۔ سارے فوجی رو رو کر اپنے ساتھیوں کو یاد کرتے رہے وہ ساتھی جن کے بدن بنگلہ دیش کی مٹی میں مل گئے تھے۔ "شاید ہمارے بدن یہاں ہندوستان کی مٹی میں مل جائیں"۔ ان میں سے ایک فوجی افسر اداسی سے بولا۔ پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی کوشش رنگ لائی اور شملہ معاہدے کے تحت قیدی پاکستان کو لوٹائے گئے۔ کیپٹن علی رضا بھی لاہور اپنے گھر واپس آ گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ فوجیوں زخم تو مندمل ہو گئے لیکن بنگلہ دیش دوبارہ پاکستان کا حصہ نہ بن سکا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے درد کی تھی داستاں جسے تم ہنسی میں اڑا گئے۔

بے قرار موسم

شدید طوفان اور بارش نے ہر طرف جل تھل کر رکھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔امیر تو اس موسم کو انجوائے کر رہے تھے لیکن غریبوں کے لیے آزمائش منتظر تھی۔غیر معمولی بارشوں سے نشیبی علاقے ڈوب جاتے تھے۔کمزور دیواروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔

اچانک تیز آواز سنائی دی۔

"اماں باہر والی دیوار گر گئی ہے"۔

صغراں کی جواں سال بیٹی فاطمہ بھاگی ہوئی اندر آئی۔

"اب کیا ہوگا اماں"

"رب وارث ہے دھیے"

صغراں نے دلاسہ دیا۔

بیٹی کو تو دلاسہ دے دیا لیکن خود وہ پریشان ہوگئی کس سے مدد مانگوں وہ سوچنے لگی۔وہ گاں میں محنت مزدوری کرتی تھی۔بیٹی جوان تھی اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی تمنا تھی۔لیکن غریب کے گھر رشتہ لینے کون آتا ہے۔

بہت سوچ بچار کر کے صغراں نے اپنے ماموں زاد بھائی کو فون لگایا۔

بار بار فون کرنے پر بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔

ہمت کر کے صغراں نے صبح شہر جانے کا سوچا۔

☆☆☆☆

"سب تیاریاں مکمل ہیں۔"

جی جناب۔

آج یتیم خانے کے افتتاح کی تقریب تھی۔سیٹھ دانش کا شمار شہر کے بڑے کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔وہ سیلف میڈ آدمی تھے۔چالیس سال محنت کے بعد اس مقام پر پہنچے تھے۔ان کی شخصیت میں بلا کا تصنع اور ریا کاری تھی۔انہیں اپنی واہ واہ بہت عزیز تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا بچپن ناداری میں گزرا تھا۔

تقریب میں شہر کی ان شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جو کہ تشہیر میں معاون ثابت ہوسکتی تھی کچھ میڈیا والے بھی مدعو تھے۔تقریب گہما گہمی اور زوروں شوروں سے جاری تھی۔

☆☆☆☆☆

صغراں بچاری بس میں دھکے کھاتی ماموں زاد بھائی سیٹھ دانش کے گھر پہنچی تو گھر پر صرف گارڈ تھا۔

وہ بچاری بھوکی پیاسی بیٹھ کے انتظار کرنے لگی۔

تین گھنٹے بعد تقریب ختم ہوئی اور سیٹھ صاحب گھر واپس آئے۔صغراں کو دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"تم کیوں آئی ہو"۔

میں نے بہت فون کیے آپ نے نہیں اٹھائے میں بہت تکلیف میں ہوں۔جوانبیٹی کا ساتھ ہے گھر کی دیوار گر گئی ہے اس کی مرمت کے لیے مجھے پیسے چاہیے۔آپ کے علاوہ سب رشتہ دار غریب ہیں۔اس لیے یہاں آ گئی"۔

اتنے میں سیٹھ کا فون بجا۔

"سر پچاس ہزار تو بہت کم ہیں اگر فنکشن کی وڈیو ہر خبر نامہ میں چلانی ہے تو بیس ہزار مزید دیں"۔

مقامی ٹی وی چینل کا رپورٹر بولا۔

" ٹھیک ہے کل آ کر لے جانا۔سیٹھ نے جواب دیا۔

"تم لوگ منہ اٹھا کر چلے آتے ہو۔پیسے کیا درختوں پر لگے ہیں پکڑو یہ پانچ ہزار اور جا"۔

سیٹھ نے جیب سے بٹوا نکالا اور ایک نوٹ صغراں کے ہاتھ پر رکھا۔

صغراں بچاری ڈر کے الٹے قدموں گیٹ سے نکلی اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ایک لاکھ کا خرچہ ہے اور یہ پانچ ہزار کا نوٹ۔اس نے سوچا۔

بس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ خیرات بانٹنے ایک سخی آیا اس نیصغراں کو بھی ایک تھیلی پکڑا دی۔صغراں نے چند نوالے کھائے اور باقی چاول بیٹی کے لیے رکھ لیے۔

اس کے روٹ کی بس آ گئی وہ بھی سوار ہوگئی۔اچانک شدید بارش شروع ہوگئی۔بس منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔بس نے آدھی مسافت طے کی تھی کہ نشیبی علاقہ شروع ہو گیا۔

بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔تا حد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔بس پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی تھی ڈرائیور بس کو آہستہ اسپیڈ سے چلا رہا تھا کہ اچانک ایک بڑا سیلابی ریلا آیا اور بس کو بہا لے گیا۔

☆☆☆☆☆☆

فاطمہ صبح سے ماں کا راستہ تک رہی تھی رات اندھیرے اور مایوسی کو دامن میں سمیٹے اپنا سفر طے کر رہی تھی کہ صبح ہوگئی۔بھوک سے نڈھال فاطمہ نے آٹا گوندھا اور روٹی پکا کر کھائی پھر وہ ہمسائے کے گھر گئی اور ہمسائے سے ماں کے جانے کی روداد بیان کی۔

"میں پتا کرتا ہوں تو فکر نہ کر"۔دین محمد نے آس دلائی۔

"ایسا کر یہیں بیٹھ جا میں پتا کر کے آتا ہوں"۔

"جی چاچا"

فاطمہ بولی اور وہاں بیٹھ گئی۔

دین محمد پتا کرتا کراتا دو گھنٹے بعد لوٹا۔

"بیٹا تری ماں نہیں رہی جس بس پر وہ سوار تھی وہ بس سیلابی ریلے میں بہہ گئی ہے" کسی کی لاش نہیں ملی اب تو صبر کر"۔ دین محمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

چاچا کی اس اطلاع نے فاطمہ پر قیامت توڑ دی۔

وہ بچاری بالکل تنہا رہ گئی۔

کچھ دیر میں یہ خبر پھیل گئی اہل محلّہ صغراں کے گھر پر جمع ہو گئے۔

سب افسردہ تھے۔ فاطمہ کے بدن میں جیسے کاٹو تو لہو ہی نہ تھا۔ افسوس کر کے آہستہ آہستہ ہمسائے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ صغراں کی لاش نہ مل سکی فاطمہ بدنصیب ماں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی۔ رات میں ایک ہمسائیفاطمہ کے گھر رک گئی۔ تین دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ یہ ہی دستور دنیا ہے مرنے والے کو لوگ بہت جلد بھلا دیتے ہیں لیکن زندہ فاطمہ کو بھی سب بھول گئے۔ فاطمہ نے سیٹھ دانش کا نمبر بار بار ملایا دوسری طرف سے نمبر بلاک کر دیا گیا۔ دن ڈھل گیا رات آ گئی آج فاطمہ بالکل اکیلی تھی۔ صحن کی دیوار مسمار حالت میں تھی اور وہ بھی اندر سے مسمار ہی ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھا گیا اور شدید بارش شروع ہو گئی اچانک بجلی چلی گئی۔ فاطمہ سٹور نما کمرے میں جا کر لیٹ گئی یہاں گھر کا کاٹھ کباڑ رکھا تھا ایک چھلنگا چارپائی اور پرانی سی پیٹی پڑی تھی وہ چارپائی پر پڑ گئی اور سو گئی۔ اچانک شور اس کی آنکھ کھل گئی۔

پپو کو ٹھوکر لگ گئی تھی۔

"دھیان سے چل یار مروائے گا تو"۔ پپو اپنے دوست فضل سے بولا۔

پپو اور فضل محلے کے اوباش لڑکے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں موبائل تھے جس کی ٹارچ کی روشنی میں وہ گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔

" کہاں چھپی ہوئی ہے نظر نہیں آ رہی"۔ فضل بولا۔

"یہیں کہیں ہو گی۔ ہے بڑی سوہنی۔

الہڑ مٹیار ہے"۔ پپو نے کہا۔

ان دونوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی فاطمہ کا خوف سے برا حال تھا۔

کمرے میں پپو داخل ہوا فاطمہ پر نظر پڑی اور بولا۔

"ارے یہ رہی۔ تو باہر چل کر اپنی باری کا انتظار کر میں آتا ہوں"۔

فضل باہر نکل گیا۔

پپو نے فاطمہ کو دبوچا اس کی عزت تار تار کی اور کمرے سے نکل گیا۔

فاطمہ سسکتی رہ گئی اس نے بہت منتیں کی لیکن بے سود۔

اب فضل کی باری آئی اس نے ہوس کی پیاس بجھائی اور وہ دونوں فاطمہ کے گھر سے نکل گئے۔

فاطمہ روتی سسکتی رہی۔ اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ اتنے میں بجلی آ گئی فاطمہ نے جیسے تیسے کپڑے پہنے کہ اس کی نظر کونے میں رکھی رسی پر پڑی۔

غربت، مایوسی، مجبوری تنہائی اور عزت کی پامالی نے اسی کی سوچنے سمجھنے کی حس کو مفلوج کر دیا۔ اس نے حرام موت کا سوچا۔

پھر اسے خیال آیا یہ تو گناہ ہے۔ میں ایسا نہیں کرونگی۔ میں حالات سے لڑوں گی۔

ہار نہیں مانوں گی۔

صبح ہوئی تو دین محمد نے بیوی سے کہا۔"آج فاطمہ کا لازمی پتا کرنا اللہ جانے کس حال میں ہوگی بچی"۔

دین محمد کی بیوی کام نمٹا کے فاطمہ کے گھر کی طرف چلی گئی۔فاطمہ کا حال دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔فاطمہ نے سارا واقعہ سنایا۔

بس میری دھی اس بات کو یہی دفن کر دے کسی کو پتا نہ چلے۔دنیا بہت ظالم ہے تجھے جینے نہیں دے گی۔چل اٹھ منہ ہاتھ دھولے میں تیرے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔دین محمد کی بیوی اپنے گھر سے ناشتہ لائی فاطمہ کو کھلایا اور اسے دلاسہ دیا کہ رات تو ہمارے گھر پر گزارے گی یہاں اکیلی نہیں رہے گی۔

فاطمہ رات دین محمد کے گھر گزارنے لگی۔

دین محمد اور اسکی بیوی دونوں فاطمہ کے لیے پریشان تھے۔کہ ایک دن دین محمد کو اس کے مالک نے ایک کام والی بچی کے لیے کہا۔مالک کی ماں بیمار تھی۔دین محمد نے فاطمہ کو بھیج دیا۔فاطمہ بزرگ عورت کی خدمت کرنے لگی۔بزرگ عورت بیمار تھی بہت ضعیف تھی۔

وہی پر ایک نوجوان آدمی ڈرائیور تھا۔اسے بھولی بھالی فاطمہ اچھی لگی اس نے دین محمد سے فاطمہ کا ہاتھ مانگ لیا۔دین محمد نے سادگی سے فاطمہ کا نکاح پڑھوا دیا۔فاطمہ کا شوہر اچھا آدمی ثابت ہوا اور فاطمہ کی زندگی کو ایک سہارا مل گیا۔

ا

بدبو

مرنے کے بعد کی گئی تعریف اور مرنے سے پہلے مانگی گئی معافی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

معافی دل سے مانگی جائے تو رب قبول کرتا ہے لیکن اس کے بندے یہاں بھی ریا کاری کر جاتے ہیں۔ٹی وی لانج کے بیچوں بیچ اس کی ساس کا جنازہ رکھا تھا۔افسوس کے لیے آئے ہوئے رشتہ دار، ہمسائے اور محلے دار اکھٹے تھے۔خواتین کی چہ مگوئیاں بھی جاری تھیں۔

"بچاری بہو نے بہت خدمت کی ہے ساس کی اللہ ایسی بہو سب کو دے" ایک عورت بولی۔

"ہاں بھئی بچاری بڑی اذیت سے مری ہے" دوسری نے کہا۔

" کینسر تھا"۔تیسری نے لقمہ دیا۔

"اندر کمرے میں بھی عجیب سی بو پھیلی ہوئی ہے"۔

"ہائے ہائے اللہ بچائے"۔ایک عورت بدبدائی۔

"میں اندر باتھ روم گئی تھی بدبو پھیلی ہوئی تھی کمرے میں شدید قسم کی اور تو اور باتھ روم کا ڈسٹبن نالی والے تھیلوں سے بھرا ہوا تھا"۔

" کیسے تھیلے ایک عورت نے پوچھا؟

"میڈیکیٹڈ ڈرینج بیگ"

آپریشن ہوا تھا دو مہینے پہلے پھر بیگ لگا گیا تھا ڈاکٹرز نے معدہ بند کر دیا تھا۔ بہت بدبو دار تیزابی پانی جمع ہوتا تھا اسی کی بدبو ہے"۔

"جنازہ کب ہے؟

"عصر کی بعد"

بہو خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی خاموشی کی یہ ٹریننگ اسے بیس سال دی گئی تھی۔بیس صبر ،درد اور بوجھل پن سے بھرے سال۔

ان سالوں کی مشقت نے اس کی ہڈیاں کمزور کردی اور سر سفید۔

اسی کمرے میں رعونت سے بھری یہ آواز گونجتی تھی جو آج خاموش ہوچکی تھی۔غرور، تکبر اور لالچ سے بھرا وجود، زہر سے بھرا دل۔

زہر رفتہ رفتہ سارے وجود میں پھیل گیا اور دل۔

دل تو شاید اس عورت کے سینے میں دھڑکتا ہی نہیں تھا برسوں پرانا شعر یاد آ گیا۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

☆☆☆☆

سارے گھر میں شور وغل کی یہ کیفیت نئی تو نہیں تھی لیکن ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

مغلظات اور طعنے...

اس کی ساس اس قدر نفرت سے دیتی تھی کہ سننے والا گنگ ہو جاتا اور تہمات لگاتے ہوئے تو ان کا دل ایک لمحے کے لیے نہ لرزتا۔

جب بہو کو ذلیل کر کر کے دل بھر جاتا تو پھر بہو کے والدین کو صلواتیں سنائی جاتی۔

کیا گناہ ہے میرا

وہ صرف یہ ہی سوچ کے رہ جاتی۔

احتراما جواب نہ دیتی ساس مزید بداخلاقی پر اتر آتی۔

دو نندیں بھی اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالنا نہ بھولتی۔

شوہر کی بے حسی سے شکوہ فضول تھا وہ مردوں کی اس قبیل سے تھا جو عورت کو غلام سمجھتے ہیں۔

بیٹے سے اشیائے خورد و نوش منگوا کے تالے لگانا، کوئی ملازم نہ رکھنا، بہو کو بھوکا رکھنا ہر رشتہ دار اور ہمسائے سے بہو کی غیبتیں کرنا پھر اس میں جھوٹ کی آمیزش کر دینا اس کی ساس نندوں کا محبوب مشغلہ تھا۔

بہو کو چار سال بانجھ پن کے طعنے دینے کے بعد جب بہو کی گود بھر گئی تو پوتی کو بھی بہو کے ساتھ ان کی زیادتیاں سہنی پڑی۔ شومئی قسمت بڑی نند طلاق لے کر آ گئی ساتھ دو بچے بھی لے آئی۔ بہو کی مشقت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

زندگی کا چہرہ ایسا بدصورت ہے کہ ایک دفعہ نظر ڈالیں تو دوسری نگاہ ڈالنے کو دل نہیں کرتا۔

کیوں ہے زندگی ایسی؟ کیوں؟

اس نے خود سے پوچھا۔

اتنے میں جنازہ اٹھانے کے لیے مرد اندر آ گئے وہ حال میں واپس لوٹ آئی۔

تدفین ہو گئی ایک ایک کر کے لوگ بھی گھروں کو لوٹ گئے۔

اسکا ذہن مسلسل بھٹک رہا تھا

کبھی کچھ یاد آتا کبھی کچھ۔

لیکن جو یادیں بھی تھیں بہت تلخ تھیں۔

وہ سب بھول جانا چاہتی تھی مگر اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔

ہر جگہ ہر چیز تلخ یادوں سے بھری ہوئی تھی ۔جس طرف بھی وہ جاتی اسکے کانوں میں وہی طعنے پڑتے ۔وہی زہر بھری آواز۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے اس کی ساس نے اس سے معافی مانگی ۔وہ خاموش بیٹھی رہی بیس سال میں کتنے مہینے تھے؟

کتنے دن تھے؟

کتنے گھنٹے تھے؟

کتنے منٹ تھے؟

زیادتیوں سے بھرے ہوئے ۔اور چند منٹ کی معافی ۔وہ بھی بند کمرے میں ۔

اتنے میں اس کی نندیں آ گئی اور وہ کھانا بنانے کچن میں آ گئی ۔

ساس نے الماری کی چابی نند کو دی اس نے ماں کا جمع شدہ خزانہ نکالا روپے ،زیور، پرائز بانڈ اور مکان کے کاغذات ۔یہ روپے زیور اور پرائز بانڈ تم دونوں آدھے آدھے آپس میں بانٹ لو اور یہ مکان کے کاغذات کبھی اپنے بھائی کو نہ دینا ۔چھپا کر رکھ لو۔

"اور بھابھی"

"بھابھی کو زیور میں سے کچھ دینا ہے"

بیٹی نے ماں سے پوچھا۔

"دفع کرو اس منحوس کو" ۔ماں نے جواب دیا۔

جنم جلی

اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے ٹکڑے کو مٹھی میں سختی سے دبایا اور اسے چھپانے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگی ۔ برسوں کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کا اب کیا فائدہ ۔اس خط کو کہاں چھپاؤں اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ۔سائیڈ ٹیبل کی ڈرا۔نہیں یہ تو ہر کسی کی رسائی میں ہے ۔

کپڑوں کی الماری ۔نہیں وہاں سے تو بہو بیگم کے ہتھے چڑھ سکتا ہے ۔کہاں رکھوں؟ کیا کروں!

پھر وہ اسٹینڈ کے سہارے چلتی ہوئی واش روم میں گئی ۔خط اور لفافے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس نے فلش میں بہا دیے ۔پھر اس نے وضو کیا اور واپس نماز والی کرسی پر آ بیٹھی ۔

وہ نماز پڑھنے لگی ۔نماز ختم ہوئی تو دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں سے اپنے والد کے لیے مغفرت اور جنت مانگنے لگی ۔اس کے آنسو گرنے لگے اور وہ رونے لگی ۔اتنے میں بہو کی آواز سنائی دی اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے ۔بہو کھانا لائی تھی ۔بہو نے ٹرے اس کے سامنے رکھی اور وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی ۔

بہو نے بغور ساس کے چہرے کی طرف دیکھا ساس اسے بہت نڈھال نظر آئی ۔ممی جی آپ ٹھیک تو ہیں ۔بہو بولی ۔

جی بیٹا میں ٹھیک ہوں ۔اس نے جواب دیا ۔

بہو خاموشی سے ٹرے اٹھا کر چل دی ۔وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی ۔

اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔اپنا لڑکپن اور پھر شادی پھر بڑھاپا۔

جوانی۔مری جوانی۔کہاں گئی۔اس نے خود سے سوال کیا۔

کیا میں کبھی جوان نہیں تھی۔

وہ شادمانی کے دن مری زندگی کا حصہ نہیں تھے۔اس نے دماغ پر زور دیا لیکن اسے کچھ یاد نہ آ سکا کوئی مدھر بھری یاد ذہن کے دروازے پر دستک نہ دے سکی۔شاید بڑھاپے سے مری یادداشت چلی گئی ہے۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔معدوم چہرے خواب میں واضح ہونے لگے۔

ڈیڈ۔ڈیڈ۔ڈیڈ۔ڈیڈ وہ دیوانہ وار باپ کو پکار رہی تھی لیکن باپ اس کی آواز سن نہیں رہا تھا پھر اسے اپنی ماں دکھائی دی۔

مما۔مما۔مما اس نے ماں کو پکارا ماں نے بھی سنی ان سنی کر دی۔

اسے اپنی بڑی بہن دکھائی دی۔

آپی۔آپی۔آپی۔آپی۔

وہ پکارنے لگی۔بہن کے کان پر بھی جوں تک نہ رینگی۔

پھر اسے چھوٹے دونوں بھائی نظر آئے۔اس نے بھائیوں کے نام لے کر بہت آوازیں دیں۔وہ سب تیز تیز چلتے گئے وہ ان کے پیچھے دوڑتی پکارتی چلی گی بھاگتے بھاگتے وہ گر گئی اور اس کے گھٹنے چھل گئے۔ہائے کی آواز اس کے منہ سے نکلی دونوں ہاتھوں سے گھٹنے پکڑے وہ زمین پر گری ہوئی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اسے اپنے ہاتھوں تلے گھٹنوں کی ہڈیاں محسوس ہوئی تو اسے یاد آیا میں تو بوڑھی ہوں۔وہ تو خواب تھا۔بند دروازوں کی اذیت پھر تازہ ہوگئی۔پہلے فون پر رابطے بند ہوئے پھر دروازے بند ہوتے چلے

گئے پھر راستے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ایک ایک کر کے سب بند ہوتے چلے گئے وہ دستک دیتی رہی لیکن سارے در دیواریں بن گئے اور اب تو اس کے قدموں میں ہمت ہی نہیں رہی تھی بمشکل اپنا بوجھ اٹھا کر اسٹینڈ کے سہارے سے چلتی تھی ۔ایک خط سے سارے زخم کھل گئے ۔کیا کروں گی میں ان کروڑوں روپے کا۔اس نے سوچا۔

لباس خریدلوں ۔مگر بوڑھے وجود پر ہر لباس بدنما ہی لگے گا۔مہنگی گاڑی خریدلوں ۔اب چلانے کی ہمت کہاں ۔اسے بچپن یاد آنے لگا جب وہ اپنے پاکٹ منی سیاپنے چھوٹے بھائیوں کے لیے کھلونے خریدا کرتی تھی ۔کب وہ بڑے ہوئے اور اس کے حصے کی ماں باپ کی شفقت کھا گئے ۔

اسے پتا ہی نہ چلا۔پھر وہ اس کے باپ کا کاروبار کھا گئے ۔والدین کے گھر کے دروازے اس پر بند ہو گئے وہ تو اس کے حصے کا سورج بھی کھا گئے ۔ بھائی جن سے اسے بہت پیار تھا۔دعا کر و اللہ میاں بھائی دے اللہ بچوں کی دعائیں سنتا ہے۔

اس کی نانی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

جن کے لیے دعائیں کیں انہوں نے اسے والدین کی دعاوں سے ہی نکال دیا۔

باری باری ساری جائیدادیں تمہارے بہن بھائیوں کے نام لکھی جارہی ہیں۔ جا جا کر اپنا حصہ مانگ کرلا۔اس کے شوہر کی آواز گونجی ۔تمہارے بہن بھائی ساری جائیداد لے جائیں گے۔

حصہ لینے کا شوق لیے اس کا شوہر قبر میں چلا گیا۔ارب پتی باپ کی بیٹی تھی اور ساری زندگی عسرت میں گزر گئی۔چھوٹی چھوٹی ضروریات ،معمولی خواہشات سب غربت کی بھینٹ چڑھ گئے ۔اس کے بہن بھائی والد کی جائیداد کی بدولت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے رہے ۔اس نے حصہ مانگنے سے انکار کر دیا تو اس کے شوہر نے خود حصہ مانگ لیا۔اور اس طرح حصہ دینے والوں نے اس پر سب دروازے بند کر دیے ۔اسے خط کا متن یاد آنے لگا۔ڈیڈ ہم میں نہیں رہے انہوں نے اپنی زیادہ تر جائیداد اپنی

زندگی میں ہی بانٹ دی تھی بقیہ کے لیے عدالت میں کیس دائر کیا ہے آپا تم اپنے شناختی کارڈ کی کاپی اور پاور آف اٹارنی سائن کر کے بھیج دو۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پاور آف اٹارنی سائن کر کے بھیج دی۔ پھر دنیا نے دیکھا کروڑوں کی جائیداد سے انہی بھائیوں نے اسے محروم کر دیا مگر اس نے اف تک نہ کی۔سب سے چھپا کر اس نے بھائی کو خط لکھا جس کے جواب میں یہ سلگتا ہوا خط آیا جس حقیقت کو وہ اتنے برسوں سے چھپاتی آئی تھی آج عیاں کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ گود میں کھلائے ہوئے بھائی نے جواب دیا تھا اور کرو پسند کی شادی۔ برسوں پہلے تم نے ہمارے منہ پر جو کالک ملی تھی اس کی پاداش میں ڈیڈ نے تمہارا شرعی جائیداد کا حصہ ہم بھائیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔آئیندہ ہم سے رابطہ مت کرنا۔

پریدہ رنگ رمیدہ بو

وہ تصویر سوشل میڈیا کی توسط سے اس تک پہنچی تھی ماتھے پر بندیا گلے میں منگل سوتر، مانگمیں سیندور ،تن پر ساڑھی اور پہلو میں کالا بھجنگ ہندو شوہر۔وہ حیران رہ گئی سیما کا نیا شادی شدہ حلیہ اس کے لیے کسی شاک سے کم نہ تھا۔دوسری تصویر میں سیما کی ماں بال سنہری کیے ساڑھی اوڑھے ماتھے پر بندیا اور سیندور سجائے ایسے مسکرا رہی تھی جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو ماں بیٹیوں نے شاید کئی سو سال بعد سومنات کا مندر دوبارہ فتح کر لیا تھا یا ایک ہندو کا دل فتح کر کیا ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جو ان کے نزدیک قابل فخر تھا جس کی تشہیر ان کے نزدیک لازمی تھی۔

اپنا ایمان ایک مشرک پر لٹا کر بھی انہیں نہ کوئی شرمساری تھی نہ پشیمانی۔ہم بے عمل مسلمانوں کے پاس ایک تو متاعِ حیات ہے کلمہ کی دولت یہ بھی لٹا بیٹھیں گے تو باقی کیا رہ جائے گا اس نے تاسف سے سوچا۔

دنیا کی ہوس انسان کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ ہاتھ سے ایمان بھی چلا جاتا ہے اس کا ذہن کئی سال پیچھے چلا گیا اسے معصوم سی سیما یاد آئی ،خوب صورت معصوم گڑیا۔سیما اس کی سسرالی رشتہ دار تھی جب بیس سال پہلے وہ بیاہ کے سسرال آئی تھی تو یہ بچی آٹھ سال کی تھی کچھ عرصہ بعد سیما اپنے والدین کے ساتھ امریکہ چلی گئی اس کے ماں باپ آزاد خیال تو پہلے ہی تھے دیارِ غیر نے ان کی سوچ کو مزید مادر پدر آزادی کا تصور دیا وہ شراب اور سور کو کھانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے بلکہ فخر کرتے کہ وہ ماڈرن ہیں سیما کی والدہ بال رنگوا کے فرنگیوں جیسا حلیہ بنا کے بہت خوش ہوتیں اپنے دین، تشخص اور

قومیت سے انہیں نفرت تھی وہ خود کو مسلمان کہلانے میں شرم محسوس کرتیں۔ جس کا نتیجہ آج ہندو داماد کی شکل میں نظر آ رہا تھا سیما کا خاندان اعلی نسب تھا شریف اور دیندار ان دین داروں کی نسل ہندو ہو گی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا رنج اور افسوس سے اس کا دل بہت برا ہوا لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔

دیارِ غیر میں بسنے والے ان پاکستانیوں پر اولاد کے معاملے میں دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو نا صرف اپنے دین سے جوڑ کے رکھیں بلکہ اس معاشرے کے ساتھ بھی چلنے کے قابل بھی بنائیں۔

جو مسلمان خاندان اس بات کو اہمیت نہیں دیتے تھے جنھوں نے بچوں کو شریک حیات کے چنا میں آزادی دے رکھی تھی ان کی تیسری چوتھی نسل اپنا دین اور تشخص بھول چکی تھی نہ وہ مسلمان تھے نہ انکا کوئی دین تھا نہ وطن وہ صرف پیسہ کمانے کی مشین تھیاور حیوانوں کی طرح آزادیِ ارادہ کے دلدادہ چند دن بعد اس کے ذہن سے سیما محو ہوگئی اور وہ اپنے معمولات میں مشغول ہوگئی کہ سال بعد پھر ایک تصویر اس تک پہنچی اس دفعہ اس تصویر کو ووٹ ایپس پر ایک رشتہ دار خاتون نے اسے بھیجا تھا۔

سیما اسکا شوہر اور سیما کی گود میں کا لاکلوٹا بچہ اسے یوں لگا جیسے بچہ اسے منہ چڑا رہا ہے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں اس نے اپنی سوچ کو جھٹکا۔ جیسی ماں باپ تربیت کرتے ہیں ویسے بن جاتے ہیں تو پھر سیما کے بچے تو ہندو ہی بنیں گے۔ دل نے صدا لگائی اور دماغ نے تائید کی۔

محبت

سرما کی سرد شام تھی فضا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی اس نے تکیے پر سر رکھا اور لحاف اپنے اوپر کھینچ لیا اسے خوشگوار سی حدت کا احساس ہوا۔تھوڑی دیر پہلے ہی گھر مہمانوں سے خالی ہوا تھا۔کل سے آوازیں ،گرم سانسیں اور جائزہ لیتی ہوئی آنکھیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں ۔کسی کا آنا اور جانا ہمیشہ بن بلائے مہمانوں کا جھمگٹا لگا دیتا ہے۔کل بھی ایسا ہی ہوا تھا ایک اطلاع اور انسان ہی انسان ۔لوگوں کی ترس کھاتی نظریں جیسے اس کے وجود میں گڑ گئی تھیں۔اس نے خود کو جھٹکا گویا نظریں ہٹا رہی ہو۔اس کے دل کی کیفیت عجیب سی تھی ۔اسے اپنے مرحوم شوہر سے محبت نہیں تھی شاید انسیت تھی یا شاید عادت۔کتنے ماہ وسال اس شخص کی دسترس میں بے ثمر گزر گئے ۔حاکم اور محکوم کا رشتہ محبت جیسے جذبے کو پنپنے بھی کہاں دیتا ہے۔

گرینی گرینی۔

اس کی نواسی آوازیں دیتی ہوئی اس کے بیڈ پر چڑھ آئی اس نے بچی کو بانہوں میں لے لیا۔بچی کی روشن پیشانی پر چوما اور کمرہ محبت سے بھر گیا۔ایک خوشگوار سی حدت ہر طرف پھیل گئی ۔اس کا وجود جیسے ہوا میں اڑنے لگا۔

گرینی آپ میرا ڈریس کب تیار کریں گی مجھے فینسی ڈریس شو میں حصہ لینا ہے۔نواسی بولی۔

بہت جلد میری جان ۔اس نے جواب دیا۔

بچی کے پھولے ہوئے گال اس کی چمکتی آنکھیں اسے ماضی میں لے گئیں۔

ماں کو اس کے وجود سے نفرت تھی اور باپ فکرِ معاش میں مصروف جبکہ نانی کو اس کے لڑکی ذات ہونے پر اعتراض تھا۔اس کے بعد جب بھائی دنیا میں آیا تو نانی ہر آئے گئے سے کہتی اللہ سے مانگ مانگ کر بیٹا لیا ہے۔

کیا بیٹی مانگنے کی چیز نہیں ہے۔اس کے معصوم ذہن کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

گرینی نواسی نے پکارا۔جی وہ حال میں پھر واپس آ گئی۔

آپ میری بات کیوں نہیں سن رہی نواسی نے اٹھلا کر کہا۔

سن رہی ہوں وہ نواسی کے گال چوم کر بولی۔میں اپنی بیٹی کی ساری باتیں سنتی ہوں اور مانتی بھی ہوں اس نے نواسی کو سمجھایا۔

اتنے میں اس کی بیٹی چلی آئی۔

کیوں امی کو تنگ کر رہی ہوں ادھر آ۔

وہ بچی سے مخاطب ہوئی۔

رہنے دو اسے یہاں تم بھی آ جا۔

اس نے بیٹی کے لیے جگہ بنائی۔

ماما میں بچی نہیں ہوں۔بیٹی بولی۔

میرے لیے تو ہو تمہیں میں نے اللہ سے مانگ مانگ کر لیا ہے۔

اس نے بیٹی کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

ناعاقبت اندیش

شدید سردی کی لہر نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دو دن سے سورج نہیں نکلا تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ مغرب کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ امجد بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسے گارمنٹ فیکٹری سے نکلے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ وہ انڈسٹریل ورکر تھا۔ اتنے میں بس آ گئی جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر نے نفی میں ہاتھ ہلایا۔ لیکن امجد زبردستی بس میں سوار ہو گیا اور دروازے سے ملحقہ اسٹینڈ سے لٹک گیا اس کا ایک پاں پائیدان پر اور دوسرا ہوا میں تھا۔ بس مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ امجد کا توازن بار بار بگڑ رہا تھا کہ ڈرائیور نے زور سے بریک لگائی۔ امجد اچھل کر بس سے نیچے گر گیا اور اس کی ٹانگوں کے اوپر سے بس گزر گئی۔ سڑک پر موجود راہ گیروں نے امجد کو سرکاری ہسپتال پہنچا دیا۔

☆☆☆☆

امجد کے والدین کے درمیان شدید بحث جاری تھی۔ امجد کی ماں جھگڑالو اور بدتمیز عورت تھی۔ وہ آئے دن شوہر سے لڑ کر مائیکے چلی جاتی۔ اس کے چار بھائی تھے جو اکلوتی بہن کی بہت سنتے تھے۔ وہ بہن کی شکایتیں سن کر بہنوئی سے گالم گلوچ کرتے۔ امجد کا والد ماجد الیاس ایک شریف اور با اصول آدمی تھا۔ اس کا ایک بڑا جنرل اسٹور تھا۔ امجد کی ماں ریحانہ بیگم انتہائی درجے کی فضول خرچ عورت تھی۔ ماجد کی ہر بات کے مقابلے میں وہ بحث کرتی اور دونوں بیٹوں امجد اور مجاہد کو باپ کے خلاف بھڑکاتی رہتی۔ دونوں بیٹے جنرل اسٹور سے چیزیں چرا کے گھر لے آتے۔ جب ماجد الیاس پوچھ گچھ کرتا تو

جھگڑا شروع ہو جاتا۔ آج بھی اسی نوعیت کا ایک مباحثہ چل رہا تھا۔ ماجد الیاس کے دکان کے گلے سے دس ہزار غائب تھے اور اسے امجد پر شک تھا جب کہ ریحانہ بیگم انکار کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال والوں نے امجد کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ ریحانہ نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔

"ہائے میرا بچہ ہائے میرا بچہ۔ مجھے جلدی لے چلو ہسپتال"۔ تین بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی فرح نے ماں کو چادر اور پرس تھمایا۔

"ماموں کو بتا دینا۔فون کر دینا" نکلتے نکلتے ریحانہ بیگم نے صدا لگائی۔

"جی امی۔" فرح نے جواب دیا ریحانہ موٹر سائیکل پر امجد کے ساتھ ہسپتال جا پہنچی۔ راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ سردی مزید بڑھ گئی۔ موسم کا ہوش کسے تھا۔ ریحانہ بیگم کے تو اوسان خطا ہو چکے تھے۔ امجد اس کا بڑا بیٹا تھا شادی کے پانچ سال بعد بہت دعاں سے پیدا ہوا تھا۔

"یا اللہ میرے بچے کو کچھ نہ کرنا۔ میرے مولا کرم کر دے۔" اس نوعیت کی دعائیں کرتے ہوئے ریحانہ بیگم کا سفر گزرا۔ ایمرجنسی میں جا کر پتا چلا کہ امجد کا فوری آپریشن ہوگا۔ امجد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسکی خون آلود ٹانگیں دیکھ کر ریحانہ بیگم کی چیخیں نکل گئی۔ چہرے پر بھی رگڑیں آئی تھیں مزید چوٹیں بھی لگی ہوئی تھی۔

"فوراً بلڈ کا بندوبست کریں۔ چار بوتلیں۔" نرس کہہ کر چلی گئی سرکاری اسپتال میں گندگی، رش اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ماجد الیاس خون کا بندوبست کرنے لگ گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ پریشانی اور غم نے دونوں کے حواس مختل کر رکھے تھے۔ بنچ پر بیٹھے بیٹھے ریحانہ بیگم کی ٹانگیں شل ہوگئی۔ وہ فربھی مائل خاتون تھی۔ سہل پسند، سست مزاج اور آرام طلب خاتون تھی۔ اگلے دن صبح کے آٹھ بجے تو ریحانہ بیگم کے چاروں بھائی آ گئے۔ ریحانہ بیگم بھائیوں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اتنے میں ریحانہ کے ساس اور نند بھی آ گئی۔ ساس اور نند سے ریحانہ بیگم کی کبھی نہیں بنی تھی۔ ریحانہ بیگم کو اپنی سفید رنگت پر

بہت غرور تھا۔سسرال والوں اور شوہر کے گہرے سانولے رنگ کا وہ مذاق اڑاتی تھی ۔ بھائیوں پر بھی اسے مان تھا۔اسی لیے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی ۔اولاد بھی ماں کا پرتو تھی ۔ ماں جیسی عادات و خصائل کی مالک اور باپ کی نافرمان تھی ۔ پانچ بچے دو بیٹے اور تین بیٹیاں گندمی رنگت لیے ہوئے تھے ان میں سے کوئی ماں جیسا سفید اور باپ جیسا سیاہی مائل نہ تھا۔مجاہد چھوٹا بیٹا سب کا ناشتہ لے کر آ پہنچا۔ ناشتہ کر کے سب آپریشن کے انتظار میں بیٹھ گئے ۔اتنے میں ریحانہ بیگم کی بہو، بہو کا بھائی اور سمدھن بھی آ گئے ۔شازیہ ریحانہ بیگم کی بہو مائیکے گئی ہوئی تھی جب یہ قیامت ٹوٹی ۔ بارہ بجے آپریشن شروع ہوا اور شام کے تین بجے تک چلا۔تین بجے امجد کو آپریشن تھیٹر سے آئی ۔یو۔سی میں منتقل کر دیا گیا۔

"میرا بیٹا ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ماجد الیاس نے پوچھا

" مجھے بہت افسوس ہے آپ کے بیٹے کی دونوں ٹانگیں کچلی گئی تھیں جسم میں زہر پھیل رہا ہے تھا اس لیے ہمیں اسکی ٹانگیں کاٹنا پڑی ۔آپ حوصلے سے کام لیں ۔" ڈاکٹر ماجد الیاس کا کندھا تھپتھپا کر چلا گیا۔ریحانہ بیگم کو غش آنے لگے۔وہ سینہ کوبی کرنے لگی۔سب تسلیاں دینے لگے۔

"ہائے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے صرف پچیس سال ۔کیسے گزارے گا اتنی لمبی زندگی ۔"امجد ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔اسکی شادی کو تین ماہ ہوئے تھے ۔ پہلے ماجد الیاس نے اسے اسٹور پر ساتھ رکھا ہوا تھا۔باپ کے اسٹور سے وہ چوریاں کرتا تھا اس لیے باپ نے اسے نکال دیا تھا۔ بڑی مشکل سے ریحانہ کو سنبھالا گیا۔شازیہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ریحانہ اور شازیہ کو شازیہ کی والدہ اور امجد کے ماموں کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا ۔ اسپتال میں مجاہد، شازیہ کا بھائی اور ماجد الیاس رہ گئے ۔رات کے اٹھ بجے پانچ گھنٹے بعد جب ایپڈ یورل کا اثر ختم ہوا تو امجد کو ہوش آ گئی۔وہ درد سے چیخنے لگا۔ڈاکٹرز نے اسے پین کلرز دیے اور بے ہوشی کے انجیکشن لگا دیے۔صبح تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔صبح سب اسپتال جا پہنچے اور امجد کو ذہنی طور پر معذوری کے لیے تیار کرنے لگے۔اتنے میں ڈاکٹر چیک آپ

کے لیے آ گئے اور امجد کو سمجھانے لگے۔امجد کو حقیقت معلوم ہوگئی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"اللہ بچارے کو پردہ ہی دے دے۔" امجد کا سب سے بڑا ماموں بولا۔حرماں نصیبی امجد سے چمٹ گئی تھی وہ جتنا بھی روتا کم تھا عمر بھر کی محتاجی نے اس کی چلنے کی استطاعت چھین لی تھی۔بہت بڑی آزمائش نے اسے گھیر کیا تھا۔

" کیا ہو گیا ہے میرے ساتھ آخر میں ہی کیوں۔" تسلی دینے والوں کے الفاظ ختم ہو جاتے مگر امجد کا درد نہ رکتا۔کوئی دلاسہ اس کے فل پر اثر نہ کرتا۔اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھتا تو حسرت سے خالی بستر پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔ایک ہفتہ بعد امجد کو ڈسچارج کر دیا گیا۔وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر اسی دروازے سے اندر داخل ہوا جس سے اپنے قدموں پر باہر نکلا تھا۔اس کے درد کا کوئی درماں نہیں تھا۔ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔وہ اسکی ماں، بیوی، بہنیں اور بھائی رہ گئے۔سب اس کا خیال رکھتے تھے۔ماجد الیاس بھی بیٹے کا ہر ممکن خیال رکھتا۔دن گزرنے لگے۔موسم بدلتے رہے۔بہاروں کی رت آئی کبھی خزاں نے ڈیرے ڈالے۔درختوں سے پتے جھڑے۔پھر نئے سبز لباس عطا ہوئے لیکن امجد کی معذوری مستقل نوعیت کی تھی اس کے لیے کوئی تبدیلی تبدیلی نہیں تھی۔وہ کمرے میں پڑا رہتا۔روتا رہتا۔خدا سے شکوے کرتا رہتا۔ریحانہ بیگم اور ماجد الیاس کے جھگڑے پھر شروع ہو گئے۔ماجد الیاس کے چار سالے اسے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔انکے خیال میں ماجد الیاس ان کی بہن سے ناروا سلوک روا رکھتا تھا۔ریحانہ مائیکے جا کر لگائی بجھائی کرتی رہتی تھی۔ماجد کا چھوٹا بیٹا مجاہد ماموں کی بیٹی کو پسند کرتا تھا۔پسند کیا دونوں کی لو اسٹوری زوروں پر تھی۔ریحانہ نے رشتے کی بات چھیڑی تو ماجد الیاس ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تری بھتیجی کو کبھی بہو نہیں بناؤ گا۔ترے بھائی نے مجھے گلی میں کھڑے ہو کر ماں بہن کی گالیاں دی

تھیں۔میرا گریبان پکڑا تھا۔نہیں بھولا میں۔"

"تو مجاہد کا کیا۔وہ صبا سے محبت کرتا ہے"۔ریحانہ بیگم بولی۔

"بھاڑ میں جائے ایسی محبت۔جو آپ کی عزت خاک میں ملا کر ملے"۔دونوں میاں بیوی کی بحث شدید جھگڑے پر ختم ہوئی۔ریحانہ بیگم ناراض ہوکر بھائی کے گھر چلی گئی۔معذور بیٹے کا خیال بھی نہیں کیا۔والدین کی اس لڑائی کا بیٹیوں پر منفی اثر پڑ رہا تھا جس کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔بیٹیاں لاشعوری طور پر ماں سے بدزبانی،خود پسندی،اور طعنہ زنی کی تربیت لے رہی تھی۔ریحانہ بیگم دو ماہ بھائی کے گھر پڑی رہی۔بار بار ماجد الیاس بلاتا رہا۔بچے فون کرتے رہے۔آخرکار ماجد نے دوسری شادی کی دھمکی لگائی۔تو ریحانہ واپس آئی۔ریحانہ کے بعد گھر کا برا حال تھا بڑی بیٹی دسویں میں تھی۔درمیان والی آٹھویں اور سب سے چھوٹی پانچویں میں پڑھتی تھی۔جوان بچیاں چھوڑ کر ریحانہ بیگم کنواری لڑکیوں کی طرح آزاد پھرتی رہتی۔امجد کا حال پوچھنے اور اس کا دل بہلانے اس کے دوست گھر پر آتے۔ایسے ہی ایک دوست نے بڑی والی فرح کو شیشے میں اتار لیا۔شازیہ بچاری خاطر مدارت میں لگی رہتی۔ذیشان نے فرح کو آتے جاتے کوئی تحفہ دے دیتا موبائل پر رابطہ رہتا۔ریحانہ بیگم کو خبر نہیں تھی۔پھر ان دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگی۔دو سال بعد جب اس نے میٹرک کر لیا تو ذیشان کی ماں رشتہ لینے آ گئی۔ماجد الیاس نے ذات پائے کو وجہ بنا کر رشتے سے انکار کر دیا۔فرح نے ذیشان کی باتوں میں آ کر گھر کے ماحول سے راہ فرار اختیار کر لی اور ذیشان کے ساتھ بھاگ گئی۔بہت بدنامی ہوئی سارے محلے کو پتا چل گیا دو گلیاں چھوڑ کر ذیشان کا گھر تھا۔پہلے تو دونوں منہ کالا کرتے رہے جب فرح امید سے ہوگئی تو نکاح کر لیا۔ماجد الیاس نے ریحانہ کو قصوروار ٹھہرایا۔ریحانہ بیگم نے اپنا قصور ماننے سے صاف انکار کر دیا۔حسب روایت دونوں کی بہت لڑائی ہوئی اور ریحانہ بیگم بھائی کے گھر ناراض ہوکر چلی گئی۔محتاج امجد ماں باپ کی تلخ کلامی سنتا رہتا مگر کیا کر سکتا تھا وہ خود پائی پائی کا محتاج تھا۔شید گرمی سے اس کی کمر پر

بیڈ شور ہو گئے تھے۔ اے سی چلاتا تو بل آتا تھا۔ اس نے بیوی سے منت کی وہ مجاہد کے ساتھ مل کر اسے کمرے سے صحن میں لے آئی۔ ماجد الیاس کا گھر دس مرلہ پر مشتمل تھا اطراف میں کمرے تھے بیچوں بیچ صحن تھا۔ چھ کمرے، باورچی خانہ اسٹور اور غسل خانے پر مشتمل یہ مکان سفید پوش محلے کے مکانوں جیسا ہوادار مکان تھا۔ چھت پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا اس کمرے میں ریحانہ بیگم کی ساس رہتی تھی۔ وہ ضعیف عورت خود کھاتی پکاتی۔ ریحانہ بیگم اسے نیچے اترنے نہیں دیتی تھی۔ شدید گرمی میں بھی وہ اوپر ہی سڑتی رہتی۔ ماجد الیاس ماں کو سودا سلف لا دیتا۔ ماں کی دیکھا دیکھی پوتے پوتیاں بھی دادی سے کھنچے رہتے۔
تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ شازیہ چائے بنانے چلی گئی۔ امجد بارش میں بھیگتا رہا اور روتا رہا۔ اس کے لیے زندگی کا چہرہ ایسا بدصورت تھا کہ ایک نظر ڈالتا تو دوسری ڈالنے کو اسکا جی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ زندگی تو اس کے ارد گرد تھی ہی نہیں۔ موت سے بدتر مایوسی تھی۔ یا شاید موت تھی اور موت کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ چہرہ تو زندہ انسان کا ہوتا ہے۔ قبر مردے کے نقوش جھاڑ دیتی ہے وہ بھی ایک قبر میں تھا۔ عذاب سے بھری ہوئی اندھیری قبر میں۔ اس کا دل چاہتا اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ تیز چلے بھاگے۔ دوڑے۔ دل کی چاہت قسمت کی چاہت نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی شازیہ چائے بنا لائی۔ وہ چائے پینے لگا۔ اسکا باپ جنرل اسٹور پر تھا اور اس کی ماں اپنے پھیرے تورے پر۔ ریحانہ کا شادی کے پہلے دن سے ہی یہ وطیرہ تھا وہ مائیکے چلی رہتی۔ ریحانہ کی ماں کے لاڈ نے ریحانہ کو بگاڑ دیا تھا چاروں بھائیوں سے چھوٹی تھی بہت لاڈلی تھی۔ بیٹے کی معذوری، بیٹی کی جگ ہنسائی کے بعد بھی اسے عقل نہیں آئی کہ اپنی عادتیں درست کرے اور گھر گرہستی سنبھالے۔ تھکا ہارا ماجد الیاس دکان سے آتا تو بدذائقہ کھانا ملتا۔ بہو کو صحیح سے کھانا نہیں بنانا آتا تھا۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر لگ گئے۔ برتن تو بچیاں دھو دیتی تھی۔ تھوڑا بہت کچن کا کام بھی کر لیتی تھی۔ لیکن وہ دونوں اسکول جاتی تھی۔ بہو بچاری بیمار شوہر کو سنبھالتی یا گھر کا کام کرتی۔ ریحانہ بیگم کی غیر موجودگی سے گھر کا سارا نظام تلپٹ ہو کے رہ گیا تھا۔ دو دن بعد مجاہد بھی

ماں کے پیچھے بھاگ گیا۔اپنی محبوبہ کزن کی محبت میں وہ پروانہ، دیوانہ بنا ہوا تھا۔اب ماں سے شادی کی ضد کرنے لگا۔ ماموں نے تلنگے مجاہد کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ مجاہد کے اکسانے پر صبا باپ کے سامنے اکڑ گئی کہ شادی کرونگی تو مجاہد سے ۔مجبورا باپ جھک گیا اور ریحانہ سے ماجد الیاس کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لانے کے لیے کہا۔ریحانہ بیگم گھر واپس آ گئی رشتے کے چکر میں ۔جب اس نے رشتے کی بات کی تو گھر میں طوفان آ گیا۔ وہ فساد پڑا کہ الامان ۔دونوں میاں بیوی اپنی ضد پر اڑ گئے ۔ریحانہ اپنی بھتیجی اور ماجد الیاس اپنی بھانجی کے لیے زور لگانے لگا۔میدان میں مجاہد بھی اپنا مقدمہ لڑنے کود پڑا۔

"اگر مجھے صبا نہ ملی تو ابا میں تجھے فائر مار دونگا۔اور تری کالی کلوٹی بھانجی سے شادی نہیں کرونگا۔" مجاہد نے بھڑک ماری۔

" جیسی ماں ویسی اولاد۔تمیز نہیں ہے ۔باپ کو فائر مارے گا۔نہ میں اس کی شادی میں جاؤنگا نہ کوئی پیسہ دونگا۔خود جو کرنا ہے کرلو۔سن لیا ریحانہ بیگم "۔ یہ کہہ کر امجد الیاس گھر سے نکل گیا۔ ماں بیٹا امجد الیاس پر لعنت بھیج کر شادی کے خرچ کی پلاننگ کرنے لگے ۔ریحانہ بیگم نے چپکے چپکے شادی کی تیاری شروع کر دی ۔سونے کا سیٹ اپنا چڑھا دیا کپڑے لتے بھی تیار کر لیے اب ولیمہ اور مہندی کے کھانے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی ۔

"وہ کہاں سے آئیں گے۔"اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے ریحانہ بیگم کے شیطانی دماغ میں ایک خیال آ گیا ۔ ماجد الیاس نے جنرل اسٹور کی مرمت کروانے کے لیے پانچ لاکھ بینک سے نکلوائے۔ پیسے گھر لا کر اس نے اپنی الماری میں رکھ دیے۔ الماری کی ڈپلی کیٹ چابی مجاہد سے کہہ کر ریحانہ بیگم نے بنوالی تھی ۔موقع دیکھتے ہی ریحانہ بیگم نے پانچ لاکھ روپے نکال لیے ۔تین دن بعد جب ماجد الیاس کو روپے کی ضرورت پڑی تو الماری خالی ۔ ماجد الیاس کے پوچھنے پر ریحانہ بیگم صاف مکر گئی ۔ پیسوں کی تلاش کے دوران ریحانہ بیگم کی بھتیجی کے لیے بنائی ہوئی خفیہ بری بھی ماجد الیاس کے سامنے

آ گئی۔نئی جنگ کا طبل بج گیا۔ ماجد الیاس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر مجاہد کی شادی ریحانہ نے اپنی بھتیجی سے کی تو ماجد الیاس گھر چھوڑ جائے گا۔پیسوں کی چوری کا مودرِ الزام بھی اس نے ریحانہ کو ٹھہرایا۔اور وجہ مجاہد کی شادی کو قرار دیا۔ ریحانہ بیگم نے بھی حقارت سے خوب طعنے دیے۔ریحانہ بیگم بھائی کے گھر جا کر مہینے بعد کی شادی کی تاریخ طے کر آئی۔جب مہندی کی قناتیں گھر سے ملحقہ گلی میں لگنا شروع ہوئی تو ماجد الیاس کو شادی کی خبر ہوئی۔اس نے بیگ میں کپڑے اور ضروری سامان ڈالا ریحانہ بیگم کو دوٹوک کہا" آج سے میرا تمہارا تعلق ختم۔تمہیں اپنی بھتیجی عزیز ہے۔بیٹا عزیز ہے تو ٹھیک اب اپنے بچے خود پالنا۔مجھ سے خرچے کی امید نہ رکھنا۔میں آج سے مر گیا تم سب کے لیے یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔

"امی ابا کو روک لو۔ابا چلا گیا تو میرا علاج کون کروائے گا"۔امجد چیخا۔

"خود ہی دھکے کھا کر آ جائے گا"۔

"ابا ابا مت جا۔" آوازوں کی بازگشت پیچھے رہ گئی ماجد الیاس آگے نکل گیا۔ ماجد الیاس نے اسٹور کے قریب فلیٹ کرائے پر لے لیا۔اس کے اسٹور پر ہر قسم کے گاہک آتے تھے۔سرکاری اسکول کی ایک بیوہ ہیڈ مسٹریس بھی سودا سلف لینے آتی تھی۔اس سے ماجد الیاس کی بات چیت شروع ہوگئی پھر گھر آنا جانا ہوگیا۔ماجد الیاس نے دوستوں کی موجودگی میں سادگی سے فردوس بیگم سے نکاح کر لیا۔فردوس بیگم پڑھی لکھی سلجھی ہوئی خاتون تھی۔وہ اچھی اور فرمانبردار بیوی ثابت ہوئی۔ماجد الیاس کو گھر کا سکون ملا تو کبھی پلٹ کر واپس نہ گیا۔وہ دوستو سے کہتا" اب پتا چلا ہے شادی کیا ہوتی ہے میں تو جنت میں رہتا ہوں۔دوسری طرف جہنم کے مکین غربت اور تنگدستی کا شکار تھے امجد معذور، مجاہد بے روزگار تھا۔صبا کے جہیز کا سامان سال بھر میں بک گیا اب تو بیچنے کے لیے بھی کچھ نہ بچا تھا۔مجاہد نے ایک دوست کے ساتھ پراپرٹی کا کام شروع کر لیا۔اب وہ گزارے لائق پیسہ کمانے لگا مگر یہ پیسہ میاں بیوی کے سیر سپاٹوں پر

لگنے لگا۔گھر میں بدستور تنگی تھی ۔ ریحانہ بیگم اب پچھتانے لگی تھی ۔جس بہو کو بہت ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی جس کی وجہ سے اس نے شوہر کی پرواہ نہیں کی تھی جلد ہی اس بہو سے ریحانہ بیگم کی کھٹ پٹ شروع ہوگئی ۔ پھوپھی بھتیجی کی ایک ذات ۔ یہ سیر تو وہ سوا سیر تھی ۔گھر کے حالات سے تنگ آ کر درمیان والی بیٹی جس کا نام زارا تھا ماجد الیاس کے گھر سوتیلی ماں کے پاس رہنے پہنچ گئی ۔مجاہد اسے چھوڑ گیا۔ فردوس بیگم نے زارا کو اپنی بیٹی کی طرح ٹریٹ کیسا۔وہ مہینہ بھر رہ کر واپس چلی گئی ۔فردوس بیگم نے زارا کی شادی کے لیے امجد الیاس کو مشورہ دیا۔

"بیٹی کے فرض سے عزت کے ساتھ بری ہو جانا چاہیے ۔"ماجد الیاس سمجھ گیا اور بھانجے کے ساتھ بیٹی کی نسبت طے کر دی ۔ ریحانہ بیگم اس لیے خاموش ہوگئی کہ شادی کا خرچہ امجد الیاس اٹھالے گا۔زارا کی شادی کر دی گئی ۔امجد الیاس نے شادی کا سارا خرچہ کیا لیکن ریحانہ بیگم اور مجاہد سے کلام نہ کیا۔ ریحانہ بیگم کی مالی مشکلات ختم نہ ہوسکی اب ریحانہ بیگم نے معذور بیٹے اور شوہر کی دوسری شادی کو جواز بنا کر امیر رشتہ داروں سے مدد مانگنا شروع کر دی ۔اڑتی اڑتی خبریں ماجد الیاس تک بھی پہنچی ۔اس نے رسوائی سے بچنے کے لیے امجد کو کریانہ کی دکان کھول دی کہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر چلاتا رہے ۔ چھ ماہ تک تو امجد نے دکان شرافت سے چلائی ۔گھر کا سودا اور دکان کا خرچہ بھی نکالا پھر یار دوستوں کو بلانے لگا۔ آوارہ لڑکوں کو دکان پر بیٹھا دیکھ کر عورتوں نے آنا چھوڑ دیا۔ گاہکی خراب ہونے لگی ۔ ماجد الیاس کے سمجھانے پر امجد وقتی طور پہر سنبھل گیا پھر اسے ایک آوارہ دوست کی وجہ سے شراب کی لت لگ گئی ۔اب دکان پر رات دس بجے کے بعد شراب کی محفل سجنے لگی ۔ساری رات پینے پلانے میں گزر جاتی ۔امجد مرزا غالب تو تھا نہیں کہ ساری رات شراب پی کے شعر کہتا اور اردو شاعری کا بے تاج بادشاہ بن جاتا ۔ وہ تو بچارہ تو معذوری کا غم شراب میں ڈبونا چاہتا تھا لیکن شراب میں اس کی دکان ڈوب گئی ۔سامان ختم ہوا تو ماجد الیاس نے مال ڈالنے سے صاف انکار کر دیا۔ دکان چونکہ مکان کا حصہ تھی ۔ بیٹھک میں بنائی گئی

تھی۔اس لیے امجد کے قبضے میں رہی۔دوست سستی شراب لاتے۔محفل جمتی اور رات گئے چلتی۔ اچانک ریحانہ بیگم کی ماں فوت ہوگئی۔اب مائیکے میں پذیرائی بھی کم ہونے لگی۔بھابھیاں موڈ ہوتا تو منہ لگالیتی۔ریحانہ بیگم کواس رویے کی عادت نہیں تھی وہ کلس کررہ جاتی۔مجاہد ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔زارا کے سسرال والوں سے جھگڑے شروع ہوگئے وہ بھی ماں کی طرح شوہر، پھوپھی، دادی اور باپ کوکوستی رہتی۔بھابھیوں کے رویے سے بے زار ہوکر ریحانہ بیگم بھائیوں سے باپ کے مکان میں سے حصہ مانگنے لگی۔سال بعد مکان بک گیا۔ریحانہ بیگم کو حصہ مل گیا۔بیس لاکھ کی رقم ریحانہ بیگم نے بینک میں رکھی اور مجاہد کو اے۔ٹی۔ایم کارڈ دے کر وقتاً فوقتاً پیسے نکلوانے لگی۔مجاہد نے ماں کے پیسے نکلوا کر لاتا تو اپنے لیے بھی دل کھول کر بٹورتا۔ریحانہ بیگم کو اے۔ٹی۔ایم کی رسید پڑھنا نہیں آتی تھی۔اسے مجاہد کے کرتوتوں کا پتا چلا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔سال میں بیس لاکھ ختم ہوگئے۔ریحانہ بیگم کو جب خبر ہوئی تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ریحانہ بیگم نے مجاہد کے لتے لیے۔وہ ڈھیٹ بن کر گالیاں سنتا رہا۔کئی دن تک ریحانہ بیگم مجاہد کو کوستی رہی۔آخر کار امجد نے کہا" امی اس نے ابو کے پانچ لاکھ بھی تو نکالے تھے اپنی شادی کے لیے۔اسے چوری کی عادت ہے"۔"وہ میں نے نہیں امی نے چوری کیے تھے مجاہد تڑخ کر بولا" بے غیرت ماں کو چور کہتا ہے۔تری شادی کے لیے نکالے تھے۔اپنے سر پر سہرا نہیں سجانا تھا مجھے "۔ریحانہ بیگم بولی۔مکافات کے اس کھیل میں ریحانہ بیگم مسلسل ہار رہی تھی لیکن اسے ابھی تک احساس نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے۔ایسے دگرگوں حالات میں بھی ریحانہ بیگم خاندان کی کوئی خوشی غمی نہ چھوڑتی۔دور دراز شہروں میں جاتی سب سے چھوٹی بیٹی جس نے جوان ہوکر خوب رنگ روپ نکالا تھا اسے تیار کر کے ساتھ لے جاتی۔کوئی رشتہ پوچھ لیتا تو میاں پر ڈال دیتی۔جوان بیٹی کی شادی کی اسے چنداں کوئی فکر نہ تھی۔فاریہ ہر وقت تیار ہوکر پھرتی رہتی موبائل سے سیلفیاں بناتی رہتی۔ٹک ٹاک پر ویڈیو بنا کر نیٹ پر ڈالتی جس پر ریحانہ بیگم نے اسے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔ایک دن اس کی ویڈیو ماجد الیاس

کے سامنے آ گئی۔فاریہ کے ٹھمکے ماجد الیاس کی غیرت برداشت نہ کر سکی۔اس نے ریحانہ بیگم کے سر پر پہنچ کر طوفان مچا دیا۔ریحانہ بیگم کو تو نیٹ چلانا ہی نہیں آتا تھا اس کی بلا جانے ٹک ٹاک کیا ہے اس کے پاس تو نوکیا 3310 تھا۔باپ کے ڈر سے فاریہ نے اکاونٹ ڈیلیٹ کر دیا۔

"اس کا رشتہ ڈھونڈ کر اپنے گھر کا کرو۔اس سے پہلے کہ یہ کوئی چاند چڑھا دے"۔ماجد الیاس نے ریحانہ بیگم سے کہا پھر بولا۔

"تم سے پہلے کبھی کچھ ہوا ہے۔جواب کوئی امید رکھوں۔میں خود ہی کچھ کرتا ہوں۔"ماجد الیاس یہ کہہ کر چلا گیا۔امجد کی شراب نوشی کے کی لگ نے گردوں پر اثر کرنا شروع کر دیا اس کے گردے ڈائلسسز پر آ گئے۔مجاہد اسے ہفتے میں دو دفعہ سرکاری اسپتال لے جانے لگا۔ہسپتال سے واپسی پر ناتوانائی اور کمزوری کے باعث امجد کی حالت خراب ہوتی تو وہ ڈھاڑیں مار مار کر روتا اور شراب کی ضد کرتا۔اس کا رونا پیٹنا ریحانہ بیگم سے دیکھا نہ جاتا وہ خود جا کر اس کے لیے شراب لاتی اور اسے بوتل پکڑا دیتی شراب پی کر وہ نشے میں چلا جاتا اور درد اسے محسوس نہ ہوتا۔اسی دوران مجاہد کی بیوی چار بچوں کی ماں بن گئی۔ساس بہو کی لڑائی ہاتھا پائی تک پہنچنے لگی تھی۔زبانیں دونوں کی تیز دھار تلواریں تھیں۔امجد پڑا گھر میں چلنے والے سارے ڈرامے دیکھتا رہتا لیکن وہ ایسا خاموش تماشائی تھا جس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔کیونکہ اس کی جیب خالی تھی فاریہ کی جس سہیلی نے اسے ٹک ٹاک کی راہ پر لگایا تھا۔فاریہ اس کے ساتھ مل کر دوبارہ ٹک ٹاک بنانے لگی۔وہ چہرے کی بجائے پشت کر کے کھڑی ہوتی اور سہیلی کیمرے کی طرف چہرہ کر کے کھڑی ہو جاتی۔تا کہ پکڑی نہ جا سکے۔فاریہ کی سہیلی رمل کی ٹک ٹاکر لڑکوں سے دوستیاں تھیں۔اس نے فاریہ کو بھی لڑکوں سے ملوا دیا۔فاریہ کی بے رنگ زندگی میں گویا بہار آ گئی۔آج تک کسی کے منہ سے اس نے اپنی تعریف نہیں سنی تھی۔لڑکوں کی باتوں نے اسے آسمان پر چڑھا دیا۔رمل آوارہ اور شتر بے مہار لڑکی تھی۔اس کے باپ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ماں کال گرل تھی۔رمل نے لڑکوں

کے ساتھ مل کر سازباز کی۔فاریہ کے عوض لمبے نوٹ لے کر رمل نے فاریہ کو چارے کے طور پر پیش کر دیا۔فاریہ کو نشہ دے کر تین لڑکوں نے استعمال کیا جس کے رمل نے ویڈیو بنالی۔فاریہ کو جب ہوش آیا تو اپنی لٹی ہوئی حالت کا علم ہوا۔وہ خاموشی سے گھر آ گئی۔تین ماہ بعد اسے اپنے امید سے ہونے کا پتا چلا۔اس نے رمل سے کہا تو رمل نے اپنی ایک واقف ڈاکٹر سے اس کا ابارشن کروادیا۔اس واقعے کے بعد فاریہ کو چپ لگ گئی وہ خاموشی سے گھر میں بیٹھ گئی۔ایک رشتہ رشتہ کرنے والی کی توسط سے آیا۔ مہمانوں کو دن گیارہ بجے کا ٹائم دیا گیا تھا۔لڑکے کی ماں، خالہ، بہن اور رشتہ کرانے والی ٹوٹل چار عورتیں ریحانہ بیگم کے گھر آ پہنچی۔جب فاریہ چائے لے کر آئی تو لڑکے کی خالہ نے اسے پہچان لیا اور شور مچا دیا۔لڑکے کی خالہ اسی پرائیویٹ کلینک میں نرس تھی جہاں رمل فاریہ کو ابارشن کے لیے لے کے گئی تھی۔

"یہ ناجائز بچے کا ابارشن کروانے آئی تھی۔تمہاری بیٹی۔اس گناہ کی پوٹ کو ہم اپنے گھر کی بہو نہیں بنائیں گے"۔لڑکے کی نرس خالہ نے کہا۔

"بے شرم، بے غیرت لوگ ہو تم۔لوگ ہم تو تمہیں خاندانی سمجھ کر آئے تھے۔اپنی گندگی تم لوگ ہمارے سر منڈنے لگے تھے۔نہیں کرنا ہمیں ایسے گھٹیا لوگوں سے رشتہ"۔لڑکے کی ماں کہہ کر چلی گئی۔عورتوں نے بھی تقلید کی۔ریحانہ بیگم غصے میں پاگل ہوگئی اس نے فاریہ کو مارنا شروع کر دیا ساتھ مغلظات کی بارش کر دی جب تھک گئی تو صوفے پر بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔آج اسے احساس ہوا کہ ہر غلطی تو اس کی خود کی ہے۔گھر کے ہر بگاڑ میں اس کا حصہ ہے۔پھر لوگوں کی زبانوں کا خوف اسے ستانے لگا۔وہ ہانپتی کانپتی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگائی اور اپنے دوپٹے سے پھندا لگالیا۔اس کا وزن زیادہ تھا پنکھے کی ہک زنگ آلود تھی۔جب ریحانہ کا وزن پڑا تو پنکھا ریحانہ بیگم سمیت زمین بوس ہوگیا۔پنکھے کا درمیانی حصہ ریحانہ بیگم کے چہرے پر لگا چہرے پچک گیا سر کھل گیا۔دماغ کا بھیجا سر سے باہر نکل گیا۔گرنے کے زوردار آواز سن کر امجد

وہیل چئیر چلاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔اور ماں کے کمرے کا دروازہ بجانے لگا۔کوئی جواب نہ ملا تو مجاہد کی بیوی صبا ہمسائے سے دو جواں لڑکے بلا لائی ان دونوں نے زور لگا کر دھکے مار کر دروازہ توڑ دیا۔ کمرے کا منظر ایسا دلدوز اور عبرت ناک تھا کہ اندر نظر پڑتے ہی ہمسائے لڑکے لرز گئے ۔امجد تڑپ گیا۔فاریہ ڈر گئی۔صبا اور شازیہ حیران رہ گئی۔ماجد الیاس کو خبر دی گئی وہ پہنچا ریحانہ بیگم کی حالت دیکھ کر وہ بھی پل بھر کے لیے ششدر رہ گیا پھر اس نے ایک چادر منگوا کر اس پر مجاہد اور بہوں کے ساتھ مل کر ریحانہ بیگم کا جسد خاکی ڈالا ۔ایک کپڑا لے کر سر باندھ دیا۔اور فردوس کو فون کر کے بلا لیا۔فردوس نے میت نہلانے والی کے ساتھ مل کر سوکن کو غسل دیا۔ بہوؤں نے مدد کی ۔مغرب کے بعد ریحانہ بیگم کی تدفین کر دی گئی ۔ بارہ بجے مرنے والی ریحانہ بیگم کو عشا سے پہلے قبر نصیب ہوگئی ۔اس کی ضد، اکڑ، نخوت،خوبصورتی اور تکبر پاش پاش ہو کر اسی کے ساتھ ابدی نیند سو گئے ۔گھر کا نظام فردوس بیگم چلانے لگی ۔فردوس بیگم کے تدبر اور فراست سے گھر میں برکت اور خوشحالی آ گئی ۔فاریہ کی سہیلی رمل نے فاریہ کو دوبارہ ٹک ٹاک کوئین بننے کا کہا اس کے انکار پر رمل نے نازیبا ویڈیو دکھا کر اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔فاریہ بدنامی کے ڈر سے رمل کے اشاروں پر چلنے لگی۔فردوس بیگم نے کوشش کر کے فاریہ کا رشتہ باہر کر دیا۔لڑکا بحرین میں ملازمت کرتا تھا۔سادگی سے شادی کر دی گئی ۔ فاریہ نے رمل کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔وہ شوہر کے ساتھ رخصت ہو کر بحرین آ گئی۔اسکا گھر بس گیا اور وہ رمل کے چنگل سے بھی آزاد ہوگئی ۔امجد کے گردے ناکارہ ہو گئے وہ بھی ماں کے پہلو میں جا سویا۔اس کی بیوہ شازیہ اپنے مائیکے چلی گئی ۔گھر میں اب ماجد الیاس ،فردوس ،مجاہد، صبا اور مجاہد کے بچے رہ گئے ۔فردوس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے صبا اس کی عزت کرنے لگی ۔ریحانہ بیگم کا بنایا مکان اس کی وفات کے بعد گھر بن گیا۔

سایا

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ماتھے پر لکیریں،چہرے کی جلد لٹکی ہوئی،گردن پر دائرے۔یہ چہرہ ایک ساٹھ سالہ عورت کا تھا البتہ جسمانی خوبصورتی ابھی بھی برقرار تھی۔اس کا بدن آج بھی سڈول اور خوبصورت تھا اس میں ایک اہم سبب سرو قامتی تھا۔

وہ ایک خوبصورت اور دل کش عورت تھی۔اس نے آئینے میں خود کو بغور دیکھا۔شدت کرب سے اس کے رخسار گیلے ہو گئے اچانک ملازمہ کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔

ملازمہ بولی: بیگم صاحبہ باہر مالی آیا ہے۔

"اچھا"اس نے جوابا کہا۔

وہ لان میں چلی گئی مالی کو ضروری ہدایات دے کر وہ اندر واپس آ گئی اور اپنی پسندیدہ جگہ پر آ بیٹھی۔یہ گھر اس نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔اس کے چپے چپے سے اسے محبت تھی لیکن اپنے بیڈ روم کا ایک گوشہ جہاں اس کا رائٹنگ ٹیبل اور ریکلائنر رکھا تھا اس کا پسندیدہ تھا۔اس نے میز کے ساتھ کرسی کی جگہ ریکلائنر لیا تھا۔اس پر نیم دراز ہو کر وہ کتابیں پڑھتی،بیٹھ کر ڈائری لکھتی اور جب بہت تھک جاتی تو لیٹ کے ریلیکس کرتی۔اس وقت بھی وہ یہ ہی کر رہی تھی کہ ملازمہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔وہ اٹھی اور ڈائنگ روم کی طرف بڑھی۔اب اس میز پر وہ تنہا تھی پہلے اس کا شوہر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔دو سال پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا۔بچے دو تھے ایک بیٹا ایک بیٹی دونوں بیاہ دیے۔بیٹی ملک سے باہر تھی۔اور بیٹا دوسرے شہر میں نوکری کرتا تھا۔بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ آتا تو گھر آوازوں اور چہکاروں سے بھر جاتا

۔اوراس کا دل خوشی سے ۔اسے کوکنگ کا شوق نہیں تھا لیکن بچوں کے لیے وہ رنگ برنگے پکوان اپنے ہاتھوں سے پکاتی ۔شوہر کے گزر جانے کے بعد اس کی تنہائی مزید بڑھ گئی تھی ۔شوہر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔شوہر سے اس کا رشتہ بہت عجیب سا تھا اسے شوہر کی عادت تھی اسے شوہر سے انسیت تھی ۔ وہ شوہر کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی لیکن اسے شوہر سے محبت نہیں تھی ۔

کھانا کھا کے وہ کمرے میں آئی اور عبادت میں مشغول ہوگئی ۔ بہار کی رت تھی ہر طرف خوب صورت پھول کھلے ہوئے تھے کھڑکی سے بھینی بھینی خوشبو کمرے میں آ رہی تھی وہ بیڈ پر نیم دراز ہوگئی اور اس کی آنکھ لگ گئی ۔ دو گھنٹے بعد عجیب بے چینی سے اس کی آنکھ کھلی ۔

مما! مما! بچی رو رہی تھی اور ماں کو پکار رہی تھی ۔

عائشہ! عائشہ!

وہ بڑبڑائی ۔ بچی روتی ہوئی بھاگ گئی ۔اس کا دل بوجھل ہوگیا ۔وقت اسے حال سے ماضی میں کھینچ کے لے گیا ۔ایسے ہی بہار کے دن تھے ۔ ہر طرف کلیاں مہک رہی تھی ۔ غنچے چہک رہے تھے ۔ خوش گوار ہوا چل رہی تھی ۔آٹھ سالہ عائشہ اٹھلاتی پھرتی ۔ پھول توڑتی اور ہوا میں بکھیر دیتی ۔وہ شوخ و شنگ زندگی سے بھرپور بچی تھی ۔

اچانک ایک سایا آتا ہے اور اسے بازو میں دبوچ لیتا ہے پھر جنونی انداز میں وحشیانہ بوسے اس کے ہونٹوں اور چہرے پر ثبت کرتا ہے وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی ہے ۔

انکل :" مجھے چھوڑ دیں میرا سانس بند ہو رہا ہے " ۔

" پلیز مجھے چھوڑ دیں " ۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے اس کا گلا دکھنے لگتا ہے وہ آدمی اسے بے لباس کر دیتا ہے ۔ جب وہ خوف کے مارے بے دم ہونے لگتی ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے ۔اچانک بجنے والی فون کی گھنٹی کی آواز اسے حال میں واپس لے آتی ہے ۔ وہ فون اٹھاتی ہے فون

اس کی بیٹی کا ہے بیٹی سے بات کرنے لگتی ہے۔

فون بند ہوتے ہی وہی اداسی دوبارہ چھا جاتی ہے_

اس کا احساسِ تنہائی اسے ماضی کے زہر سے آلودہ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔عفریت اسے نگلنے کے لیے بے قرار ہے اپنی گرتی ہوئی ذہنی حالت اسے نڈھال کر دیتی ہے کسی نفسیاتی معالج کے پاس جاں وہ سوچتی ہے پھر پچھلا تجربہ اسے مزید مایوس کر دیتا ہے۔

پندرہ سال قبل بھی اس نے ایک نفسیاتی معالج سے رجوع کیا تھا۔اپنی زندگی سے وابستہ ڈیپریشن کو دور کرنے کے لیے۔معالجاس کے مسئلے کی تہہ تک نہیں پہنچ پایایا اس نے معالج کو اپنی ذات تک رسائی نہیں دی۔معالج نے اسے اینٹی ڈیپریشن گولیاں دے دیں۔جن کو کھانے کے بعد وہ کئی گھنٹے بے سدھ سوئی رہتی۔اس کی یادداشت پر اثر پڑنے لگا وہ بھولنے لگی لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہوا کہ وہ ماضی کا کوئی لمحہ نہ بھول سکی صرف حال سے جڑے واقعات اور لوگ مدہم ہونے لگے۔کئی ماہ اس عالم میں گزارنے کے بعد اس نے مذہب میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی اب دل کو تھوڑا سا سکون ملا۔لیکن یہ سکون بھی وقتی ثابت ہوا چند سال بعد گھر بدلا۔نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔نئی آبادی میں ایسا کوئی سلسلہ نہ بن سکا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی تنہائی اسکی ذہنی حالت مخدوش کرتی جا رہی تھی۔رات میں اکثر خوف سے اس کی آنکھ کھل جاتی وہی عفریت اسے دبوچ لیتا اور اس کا سانس بند ہونے لگتا۔

دفعتا دروازہ چرچرایا۔ایک سایا اندر داخل ہوا۔اور بستر پر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔اس نے بازو آگے بڑھائے اور اس بچی کو بانہوں میں بھرنا چاہا بچی بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی وہ بھی بچی کی پیچھے بھاگی۔رک جا۔رک جا۔میرے پاس آ۔

اس کی آواز سن کے ملازمہ پہنچ گئی۔" یہاں تو کوئی نہیں ہے "۔ملازمہ بڑبڑائی پھر بیگم صاحبہ کس کو

بلا رہی ہے۔

چلی گئی"۔وہ بولی اور ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے کمرے میں چلی آئی۔

"آج بھی میں اسے سینے سے نہیں لگا پائی"۔وہ خود سے مخاطب ہوئی۔

ملازمہ جو پیچھے آ رہی تھی بولی" یہاں تو کوئی نہیں ہے بیگم صاحبہ!"

"تم جاؤ"۔اس نے ملازمہ سے کہا۔

وہ پلنگ پر ڈھے سی گئی۔

ماضی کا عفریت اسے نگلنے لگا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔صبح طبعیت میں کسلمندی تھی۔وہ کافی دیر تک بستر میں پڑی رہی۔صبح کی روشنی دروازے پر کھڑی رہی۔اداسی نے در و دیوار کو مضطرب سا کر دیا۔کافی دیر بعد وہ بستر سے نکلی اور منہ ہاتھ دھو کے ڈائینگ روم کا رخ کیا۔

"ناشتہ لاؤ" اس نے ملازمہ سے کہا۔

"صبح علی صاحب کا فون آیا تھا آپ سوئی ہوئی تھی میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا"۔ملازمہ نے بتایا۔

"ٹھیک ہے"۔اس نے جواب دیا اور ناشتہ کرنے لگی۔

ملازمہ نے اس بغور دیکھا اور دل میں بولی۔

"میں نے بھی بیگم صاحبہ کی ذہنی حالت کے بارے میں سب بتا دیا ہے کہ کسی سے باتیں کرتی ہیں۔سٹھیا گئی ہیں"۔

دو تین دن خاموشی سے گزر گئے۔

موسم خوش گوار تھا وہ لان میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی سامنے دیکھا تو وہی بچی پھولوں سے کھیلتی نظر

آئی اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔وہ بچی کو ہاتھ ہلانے لگی۔ملازمہ یہ منظر اندر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی لان میں تو کوئی نہیں ہے۔پھر بیگم صاحبہ کس کو ہاتھ ہلا رہی ہیں۔ملازمہ نے حیرت سے سوچا۔

منظر میں اچانک ایک آدمی شامل ہو جاتا ہے جس کی عمر تقریباً تیس سال ہے اور حلیہ ملازموں جیسا ہے یہ پست قد مکروہ آدمی بچی کی طرف بڑھتا ہے۔وہ کرسی سے اٹھتی ہے خوف سے اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے" نہیں.. نہیں اسے چھوڑ دو"۔وہ چلاتی ہے۔آدمی بچی کو اٹھاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔

"عائشہ.... عائشہ"وہ آوازیں دیتی ہے۔

بچی ہاتھ پاؤں مارتی ہے اسے مدد کے لیے بلاتی ہے لیکن آج بھی آدمی جیت جاتا ہے اور وہ ہار جاتی ہے۔

"عائشہ.. عائشہ"......وہ بڑبڑاتی رہ جاتی ہے۔

ہر نیا دن اس کے اضطراب میں مزید اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔

ملازمہ اس کے بیٹے کو فون پر آنے کا کہتی ہے۔بیٹا مصروفیت کا رونا روتا ہے۔اور ملازمہ کی بات کو سنجیدہ نہیں لیتا۔

اس رات شدید طوفان آتا ہے بجلی چلی جاتی ہے۔جنریٹر بھی جواب دے دیتا ہے۔وہ بستر میں لیٹی ہوئی ہے۔ملازمہ کمرے سے باہر لانج میں صوفے پر لیٹی ہوئی ہے۔سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔

اچانک اسے عائشہ دکھائی دیتی ہے" مما مما مجھے بچاؤ"وہ چلاتی ہے۔عائشہ! عائشہ......

اس کی آواز اندھیرے میں ابھرتی ہے۔" بیگم صاحبہ کو پھر دورہ پڑ گیا خدا خیر کرے"۔ملازمہ بڑبڑائی۔

وہ ننگے پاں کمرے سے نکلتی ہے اور عائشہ کو ڈھونڈنے لگتی ہے اندھیرے میں وہ چیزوں سے ٹکراتی

ہے۔ملازمہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس پر تو کوئی آسیب سوار ہے۔وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہے۔

"میں آ رہی ہوں عائشہ "۔رکو! ٹھہرو!۔

ٹھہرو!

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہے۔

"رک جائیں بیگم صاحبہ بہت اندھیرا ہے۔اوپر مت جائیں"۔ملازمہ اسے پکارتی ہے۔لیکن وہ اردگرد سے بے نیاز ہے۔اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھتی ہے۔اوپر اسے عائشہ دکھائی دیتی ہے۔روتی ہوئی۔

وہ آخری سیڑھی پر پہنچ کر ہاتھ بڑھاتی ہے اور عائشہ کو تھامنے کی کوشش کرتی ہے۔اچانک عائشہ غائب ہو جاتی ہے اور وہ توازن کھو بیٹھتی ہے۔وہ سیڑھیوں سے نیچے گرتی ہے۔ملازمہ بھاگ کے اس کے قریب آتی ہے۔اس کی تشویشناک حالت دیکھ کر ملازمہ اسکے بیٹے کو فون کرتی ہے۔بیٹا اسپتال لے جانے کا کہتا ہے ملازمہ ایمبولینس کو فون کرتی ہے اور اسے لے کر اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرتا ہے اور طبی امداد مہیا کرتا ہے وہ زیر لب عائشہ عائشہ بڑبڑا رہی ہے اتنے میں اس کا بیٹا بھی پہنچ جاتا ہے۔ملازمہ اسے حقیقت سے آگاہ کرتی ہے اور سارا واقعہ تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

وہ غنودگی میں عائشہ عائشہ پکار رہی تھی ۔بیٹا جھک کر سننے کی کوشش کرتا ہے۔اور حیران رہ جاتا ہے۔

عائشہ تو ماما کا اپنا نام تھا وہ خود کو کیوں پکار رہی تھیں ۔بیٹا بڑبڑایا۔اس کی سانسیں رکنے لگتی ہیں اور وہ دم توڑ دیتی ہے۔ڈاکٹر سوری کہہ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

سوانحی اشارات

نام: نادیہ لودھی

قلمی نام: نادیہ عنبر لودھی

تعلیم میٹرک: پی اے ایف اسکول کورنگی کریک کراچی

ماسٹرز: ایم اے اردو پنجاب یونی ورسٹی لاہور

اصناف سخن: غزل، نظم،، ناول، کالم، افسانہ

مدیرہ: خبریں مانچسٹر یو کے

2016 تا حال

کتابیں

مجموعہ کالم: شبِ غم کا جوش

مجموعہ کلام: تعاقب میں خواب

ناول: خاکدان

کہانیاں: گمراہ



نادیہ عنبر لودھی کی دوسری کتابیں

- شبِ غم کا جوش (کالمز)
- تعاقب میں (مجموعہ کلام)
- خاکدان (ناول)
- گمراہ (کہانیاں)